



کوشش خند



**PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani**

**Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081**



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنز»  
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ



# نظارے

کرشن چندر

پبلشرز، بکسٹرز جنرل آرڈر پلانر  
فون ۲۸۸۵ چوک ٹیمپل شیبہ بازار، نئی دہلی

بکسٹرز

بارادک ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء

اہتمام : شامہ حمید شفیقہ الرحمٰن

آرٹے خیال آرٹس سٹوڈیو لاہور

مبلغ طفیلہ آرٹس پرنٹرز لاہور

قیمت : بارہ روپے پچاس پے

پبلشرز سٹیشنرز بک سیلز،  
چوک فیصل شہید جہلم شہر فون ۲۸۸۵

بک کارنر

# رفقہ رفقہ

۷	جنت اور جہنم
۲۲	بے رنگ و بو
۲۶	آنسوؤں والی
۶۰	بچپن
۸۰	گلفروشن
۱۰۰	دو فرلانگ لمبی سڑک
۱۱۴	پسند والی
۱۳۱	ویکھی نیٹر
۱۴۹	خوفِ بناچ
۱۶۰	دل کا چراغ
۱۶۸	سفید پھول
۱۹۶	تلاش

# جنت اور جہنم

زینتی سے متعلق میں کیا جانتا ہوں، یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مدوجزر کی طرح دل کے ساحل پر آتی ہیں اور اکثر نہایت ہی لطیف، ناپائدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور عموماً یہ مبہم نئی تصاویر لہروں کے دوسرے ریلے ہی میں لیں فنا ہو جاتی ہیں کہ پھر کوئی ان کا نام و نشان بھی نہیں پاسکتا۔ یا پھر نئے نقوش اپنی تازہ نو اور حیرت انگیز آج سے نئی جہلیاتی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے آغوش میں اس ساحل کی ریت کا ہر ذرہ گنگنا اٹھتا ہے۔

کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی۔ یا بغیر حیات کے

ایک اضطرابی کیلئے ہے۔

لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائدار اور مبہم نہیں ہوتے اور وہ



ساحل حیات پر اسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں جو مدت تک قائم رہتی ہیں۔  
 ایسی ہی تصویروں میں سے ایک تصویر زینتی کی بھی ہے اور  
 دراصل ایک ہی نہیں بلکہ تین، کیونکہ جب کبھی مجھے زینتی کا خیال آتا ہے  
 تو بیک وقت اس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں، تین  
 مختلف تصاویر، تین مختلف لمے، نگاہ کے تین مختلف زاویے، جس  
 طرح سات رنگوں سے مل کر قوس قزح بنتی ہے ایسی طرح ان تین تصاویر  
 کی ترتیب سے زینتی کی زندگی کی کہانی بن جاتی ہے لیکن یہ زندگی قوس  
 قزح سے بہت مختلف ہے کہیں مختلف !

دیکھنے میں تو زینتی قوس قزح کی طرح ہی حسین تھی۔ میں نے  
 جب پہلے پہل اُسے دیکھا، تو اس وقت میں سات لہروں والے شہر  
 کے سب سے خوبصورت پل امیر اکدل پر جھکا ہوا بھلم کی سطح پر تیرتی  
 ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں ہی بیکار سا، آوارہ سا، اکتایا ہوا،  
 سری نگر کی دلچسپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا تھا۔  
 شکاروں کے لال لال پھولوں سے کڑھے ہوئے پرے  
 ایک طرف کوٹے ہوئے تھے۔ اور ان میں کہیں موٹے موٹے  
 مردوں کیساتھ پریوش عورتیں سوار تھیں۔ جن کے چہرے اور حسن  
 ملائی آؤریزے دھوپ کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے۔

کہیں تو منہ و جیبہ نوجوانوں کے ہمراہ بھدی اور بیکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھتی تھیں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں، جو عورت جتنی زیادہ بد صورت تھی۔ وہ اتنا ہی اچھا اور بھڑکھلا لباس پہنے تھی۔ دراصل پردے کی رسم تو ان ہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی۔ اور ان کے شوہروں کے چہرے کم از کم اس وقت تو اسی خیال کے آئینہ دار تھے۔

بیمارے دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت عورتوں کو گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے اور ان کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب، میٹھی آواز میں ہنس ہنس کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، کم از کم مجھے ان کی آواز بہت شیریں معلوم ہوئی۔ شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر کوئل کا ننگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔

شکارے خوبصورت اور بد صورت مخلوق سے لدے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں زندگی کی حرکت، بے چینی، اضطراب سب کچھ موجود تھا۔ وہ پانی کی سطح پر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے لال لال پردے ملتے ہوئے دکھائی دیتے۔ بھدی شکلیں حسین تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں، تہقے اور ہانچوں کے گیت ایک

ہی نغمہ بن جاتے اور وہ شکارے دربار ہلال کے سامنے اس کے سفید  
 سفید ستونوں کے قریب پہنچ کر شہر و فیس کا سانپا رہ پیش کرتے ہوئے  
 یک سخت موڑ پر غائب ہو جاتے، لیکن یہ حرکت، یہ زندگی ان لمبے لمبے  
 دھوم درجے کے ڈونگوں یا ہوس بوٹوں میں بدلتی جو پانی کی سطح پر چپ  
 چاپ بدنا بلخوں کی طرح تیر رہے تھے۔ ان کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن  
 پرے آویزاں تھے۔ صرف ایک ہوس بوٹ میں ایک کھڑکی کھلی تھی۔  
 کھڑکی کے دونوں طرف دو انگریز عورتیں بیٹھی ہوئی سو میٹر بن  
 رہی تھیں۔ کیا یہ لوگ سری نگو میں سو میٹر بننے کیلئے آتے ہیں یا میری  
 طرح پل کے جھگلے کے قریب کھڑے ہو کر محض تماشا دیکھنے کیلئے؟  
 اور پھر مجھے اس وقت زنجی دکھائی دی، جہلم کے پانی کا ایک  
 ہی ریلا اُسے میرے دل کے ساحل کے قریب کھینچ لایا۔ وہ ایک چھوٹے  
 سے ڈونگے کے کنارے پر کھڑی کشتی کا رخ بدل رہی تھی۔ رخ بدلنے  
 کا چو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور چاندی کا ایتھمکا "اس کے کان میں  
 کسی خاموش نغمے کی گت پر لڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر جیسے وہ بجلی کی  
 تیزی کی طرح پل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور مجھے ڈونگے کا دوسرا سرا  
 نظر آیا۔ یہاں ایک لمبی سی ڈائمنڈ لے ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے  
 کو کئے رہا تھا۔ اس کا گول سر رخ و سپید چہرہ اور سر پر گول منقش ٹوپی،

بھی پل کے نیچے غائب ہو گئی۔ اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پہلی کی دوسری جانب آچکے تھے۔ وہ ڈونگے کو نچلے گھاٹ پر لگانے کے لئے درخ بدل رہے تھے۔ ڈونگے کی سب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں کے زرد زرد پڑے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے کمن ٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے کا نام پڑھا جو دھوپ میں چمکتے ہوئے ظلم کے ٹکڑے کی طرح درخشاں نظر آ رہا تھا۔

"THE HEAVEN" "جنت" یہ نام غالباً کسی عیش پسند سیاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہو گا۔

جنت اب نچلے گھاٹ کے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ڈرائیگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکھ لورڈ لٹک رہا تھا۔ "TO LET" "جنت کراٹے کیلئے خالی تھی۔ میں جنگل سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ نتیجی اور چھوٹا لڑکا اب اسے کنارے پر باندھ رہے تھے۔ مٹا میرے دل میں ایک خیال آیا۔ اور میں ایک تیزی سے امیر اکدل کے پل سے گزرتا ہوا نچلے گھاٹ کی سیرسویں کی طرف چلا گیا۔

زینتی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا۔ پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لئے ایک عجیب جھبک اور ایک عجیب جھبکی کے ساتھ

کشتی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اور چھوٹے لڑکے سے بولی۔

”عزیزا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ۔“

عزیزا ہنستا ہوا اٹھا۔ وہ یونہی ہنس رہا تھا بغیر کسی وجہ کے، کشتیری لڑکوں کی طرح، اس کے دانت جو ٹوٹے پیٹ کے استعمال کے نصیب ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے اس کے سرخ بوٹوں کے درمیان بوتوں کی لڑائی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بے پروائی سے زینتی کے قدموں میں پھینک دی۔ اور پھر زینتی نے جس ملائمت اور ملاحظت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا ہے۔ اسے کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ اس کی آنکھیں عزیزا کی اس محسوس شوخی پر ایک دم اس طرح چمک اٹھیں جیسے سحر کے وقت ڈل کے خاموش نیٹ پانی پر آفتاب طلوع ہو جائے اور جب میں عزیزا کے ساتھ ڈرائیگ روم میں داخل ہوا تو زینتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔ عزیزا کہنے لگا۔ ”یہ ڈرائیگ روم ہے۔ یہ اس طرٹ آئینہ والا مینر ہے،“ یہ لکھنے کا مینر۔

اور میں نے عزیزا سے پوچھا۔ ”کیا یہ ہوس بوٹ

تھارے اور وہ لڑکی کون ہے؟“

”وہ۔۔۔“ عزیزا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے

ہوئے کہا۔ " وہ زینتی ہے میری خالہ، یہ ہوس بوٹ زینتی کے غاوند کا ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں سو پور گیا ہے۔ یہ اس الماری میں چلنی کے برتن، دو سیٹ، چمچے، پرچیں، یہ کھانے کے برتن، دو گیس لمپ۔ " اچھا، اچھا، آگے چلو۔ "

" یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے ان میں پانچ پلنگ آسکتے ہیں۔ میں اور زینتی اس کمرے میں رہتے ہیں، وہ چھٹا سا کمرہ، جو کچن کے قریب ڈونگے کے دوسری طرف ہے۔ " اچھا چلو کچن دکھاؤ۔ "

سب کچھ دیکھ لیا، اس چوٹے سے روم درجے کے ڈونگے کو جسے زینتی اور عزتیا فخریہ لہجہ میں اپنا ہوس بوٹ کہتے تھے۔ زینتی اور عزتیا کے ہونے والے، صاعب نے جسے پنجاب میں اس کے سب دوست اس کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے " لگڑ بگڑ یا چرخ " کہتے تھے۔ سب کچھ دیکھ لیا۔ لیکن زینتی کو بار بار دیکھ کر اس کے دل کی پیاس بجھی۔

" زینتی ! " میں نے اپنی پستون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرہ اڑاتے ہوئے پوچھا۔ اس — زینتی، اس ڈونگے کا میرا مطلب ہے اس ہوس بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا ؟ "

زینبی نے اپنی ہانک آواز میں کہا: کیا صاحب یہیں رہیں گے؟

”ہاں، ہاں اسی بڑے میں۔“

”تب یہ کرائے کیئے خالی نہیں۔“

”اے۔۔۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا

وہ کیوں؟

عزیزا جنتے ہوئے بولا: ”صاحب یہیں ڈلر جانا ہے۔“

دراصل میں سو پور جانا ہے، مگر راستے میں ڈلر آئے گی بھیل  
ڈلر اور مانس بل، ہم یہ ڈونگا لے کر سو پور جائیں گے جہاں زینبی کا  
گھر والا آگیا ہے، پھر ہم اس کو لے کر واپس آئیں گے اگر صاحب  
کو ڈلر دیکھنا ہے، تو منظور ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی  
تھوڑا ہو گا۔ اگر صاحب کو ادھر ہی رہنا ہے تو پھر ہم مجھ میں۔“

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچا رہا۔ عزیزا کا جنتا ہوا محسوس

سا چہرہ بہت پُر امید تھا۔ گویا وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”چلو صاحب، ڈلر دیکھنے چلو صاحب۔“

میں نے زینبی کی طرف دیکھا۔ زینبی کا چہرہ آغل کی اوٹ

میں تھا۔ کیا وہ بھی اپنے خاوند سے ملنے کیلئے بیقرار تھی۔ اور تو۔

اے شاعر مزاج آوارہ سیاح! تو اس خطرناک مشن کو کیوں

پورا کرنا چاہتا ہے ؟ ہوس کے غلام کیا تیرے لئے اس دنیا میں کوئی  
اور کام نہیں ؟ کوئی آرزو کوئی صلح نظر نہیں ؟

لیکن دل کے ساحل پر اس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی  
جھکی اور طیف ہوتی ہیں، آئیں اور چلی گئیں، اور ساحل کی ریت اپنے چمکتے  
ہوئے لاکھوں ذروں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے۔  
میں نے آہستہ سے کہا : ” اچھا عزیزا آج شام کو تم اس  
ہوس بوٹ کو امیر اکدل کے سامنے — اس گھاٹ پر لے  
آنا، کل ہم دوڑ چلیں گے ۔ “

” بہت اچھا صاحب ۔ “

عزیزا نے پرمست لہجہ میں کہا :

زین کا چہرہ بدستور آغیل کی اوٹ میں تھا ۔



بھری سنگم دانی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے (جہاں میں  
 بٹھرا ہوا تھا) راستہ بھر انسانی زندگی کی حماقتوں پر غور کرتا رہا۔ حسن کیا ہے  
 اور انسان بد صورتی سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متاثر ہوتا ہے؟ حسین  
 پھول جب مرجھا جاتا ہے تو اسے آپ پاؤں تلے کیوں روند دیتے  
 ہیں؟ اور کیوں ایک عورت پانچ بچے جنم کے بعد آپ کی تعریفی  
 نگاہوں کی تسبیح نہیں رمتی؟ یہ کیوں کرتا ہے کہ ایک تنومند کسان  
 دن بھر ایمان داری اور صدق دلی سے کام کرتا ہوا اور دن بھر خدا کو  
 یاد کرتا ہوا بھی اپنے اور اپنے بال بچوں کیلئے نان و نفقہ مہیا نہیں  
 کر سکتا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے گناہوں اور اذیتوں  
 کا بار گراں لئے ہوتے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چھڑک کر اس

دلفریب دادی میں جنت کے مزے لوٹنے کیلئے آجاتے ہیں، اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنت ہتیا لی وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنت نہیں چھین لیں گے؟ تقدیر؟ تناسخ؟ رخصا؟ اور پھر یہ تو زندگی کی حقائق ہیں ان کے بارے میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے؟ کیا یہی کافی نہیں کہ زینتی حسین ہے اور اس کا خاندان سوچا گیا ہوا ہے اور کل ہم اس کے ڈونگے پر سوار ہو کر ڈونگے بارہنے میں؟

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو بھی میری ریلے سے متعلق نظر آتے تھے۔ گو بخش اپنی داڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا۔  
 ”میں بھی چلوں گا۔“

بھتیالال بولا: میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گزر ہی جائیں گے۔ اور آخر اب یہاں سرینگر میں رکھا ہی کیا ہے کیوں سرفراز؟  
 میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

محمود بولا: ”کیوں جی میں بھی چلوں؟“

اب رہ گئے اندر اور سٹل، وہ دونوں بند کی طرف سیر کو گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو انہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ شیراز کی زندگی کی حقائق پر غور کرنا، بنیہ سب سے بڑی

حفاظت ہے اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی وُتر کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔  
گورنمنٹ نے کہا۔

”آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سب اسباب  
رے چلو۔ ہارنیم، عبلہ، گراموفون، کیمرہ، دوربین، بستر، مٹھائی، انڈے کیک  
پھل اور ہاں میں بھول گیا تھا، تم لوگ اپنے لئے نجاست کا سامان  
بھی لیتے چلو، اور ہاں بھی سرفراز، تم وہاں سے اس کم بخت ڈونگے  
والے ہی کو بلالالتے۔ اسی سے یہ سامان اٹھا کر لے جانے کو کہتے۔  
کوئی کم بخت آدمی اس ڈونگے کا مالک و الگ نہیں ہے  
بلکہ اس کی مالک تو ایک لڑکی ہے۔“

”لڑکی۔؟“ سب نے یکایک چیخ کر کہا۔

”برس پندہ یا کہ سولہ کا سن۔“

لیکن انہوں نے مجھے شعر پورا نہ کہنے دیا، دوسرا مصرعہ  
زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح چل پڑے  
”ابے اوگاؤ دی۔“ ابے لگڑ بگڑ یا چرخ۔ اس کا نام کیا ہے  
”بھل کیسی ہے؟“ بچہ ہی بتاتے ہو یا اپنا گلہ دہاؤ گے؟“

میں سرنگر سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے اور

اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مالاکس ہو چکے تھے، وِزرات  
کھانے پکانے اور کھانا کھانے کے سوا اور کیا کام ہو سکتا تھا۔  
ہاں کبھی کبھی بُرج کھیلنے اور کبھی کیرم۔

ڈونگا اپنی دھیمی چال سے جہلم کی سطح پر بہتا جا رہا تھا۔ محمود  
اکثر صوبہ میں لگاے مان دور کے اور بلند سلسلہ ہائے کوہ کی طرف  
دیکھتا رہتا۔ جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں۔

گورنمنٹ ہارمونیم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلے سے  
سر ملی تانیں نکالتا اور بھیا لال اپنے دبے پتے جسم اور لمبے قد کے  
ساتھ بار بار ڈونگے کی چٹ کو ہاتھ لگا کر ہم کو تاح قدوں کی تفصیلات  
کر کے اپنی بدنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا۔

اور زنجی، لیکن زنجی کے تو ہم سب پرستار تھے، گو میں اپنا حق سب  
پر فائق سمجھتا تھا اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اسی طرح واضح  
کر دی تھی۔ لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہو گیا کہ یہ چروا کسی کے جال  
میں پھنسے والی نہیں۔

اس کی ادائیں دِل رہا تھیں، اس کے گیت دکھن، اسکی  
مسکراہٹ دل افروز، لیکن اسے اپنے غامد سے محبت تھی اُسے

اپنے غامد پر ناز تھا جو سوپور میں تماشہ معاش میں مصروف تھا۔ جب وہ چوہ چلاتے چلاتے یکایک منہس پڑتی تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کیلئے نہ ہوتی۔ عزیزا کیلئے بھی نہیں، جو اُسے اتنا پیارا تھا۔ پھر کبھی چوہ ہاتھ سے چوڑ کر سیدی کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی۔ اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی بدھر سوپور تھا۔ اس وقت گھونٹش ایک بے سرے لہجے میں چلا اٹھتا۔ "دلدار خداں والے دا — دلدار !"

بھیا لال نے تو پہلے دن ہی زینتی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔  
 "گو شکل و صورت سے تو میں روایتی بھنوں ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلیٰ مجھے محبت کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی، اور اس لیلیٰ پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کی کسی لیلے کو بھی میری چاہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے "اے میری پہاڑی لیلے! گڈ بائی۔"

لیکن بھیا لال ہی پر کیا منحصر ہے، قریباً قریب یہی حال ہر ایک کا تھا۔ شروع شروع میں گو غنیش نے زینتی کو ایک دو دن سریلے عشقیہ گھیت سنائے تھے۔ اور کچن میں بیٹھ کر مچھلیاں جھونتے جھونتے اسے مچھلیوں کی ایک پلیٹ بھی پیش کی تھی۔ اور کبھی کبھی اندرا دھڑلے پھلوں کے نوکروں میں سے سیب اور ناشپاتیاں چُرا کر اُسے دے دیا کرتے تھے اور اُن کبھی کبھی ایک کے ٹکڑے بھی۔ لیکن اب

چند دن سے یہ فیاضی بند کر دی گئی تھی۔ اور اب سب لوگ زینبی کو قریباً بھول گئے تھے۔ اب وہ دن رات کھانا پکانا گانا ناچنا جہلم میں تیرنا اور اسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ ہر ایک چہرہ بکاش نظر آتا تھا، اور ان سات دنوں کے قلیل عرصہ ہی میں ہر ایک کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا وزن پہلے سے ڈگنا ہو گیا ہے۔  
 بھیا لال نے اپنی پتی کمر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

• ارے یار میں تو سپریم پم موٹا ہو رہا ہوں، اب یہ پتلون مجھے کمر کے گرد تنگ معلوم ہوتی ہے۔  
 اندر نے اپنے چمکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔  
 • مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے گال اب پہلے سے چمکے ہوئے نہیں رہے۔

رمتل بولا۔ • اب میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے چہرے پر سرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔  
 عمود جو اشتر کی خیالات سکھاتا طنز یہ لہجہ میں بولا۔  
 • ہاں، انقلاب آرہا ہے۔

انقلاب تو خیر ایک دور از کار بات تھی۔ لیکن اس میں

ٹھک نہ تھا، کہ سو پھر ضرور قریب آ رہا تھا۔ کل ڈالر اور پوسٹوں سو پور اور پھر شاید زینتی کی یہ شوخ ادائیں ہمیں عمر بھر متاثر نہ آسکیں گی۔ میں کچن کے دروازے پر کھڑا ہو کر زینتی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چھوٹے گشتی کارٹرغ ٹھیک کر رہی تھی۔

ڈونگے کے دوسرے سرے پر کہیں عزتیا پسینے میں ترتر ڈانڈ چلا رہا ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا، چارہ غریب گیارہ سال کا لڑکا لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچن کے عقب میں جو کمرہ تھا، وہاں محمود سویا پڑا تھا۔ اور اس کے ہلکے ہلکے خراثوں کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ کبھی کبھی ڈرائنگ روم سے ہنسی کی ایک بلند جمع سنائی دیتی۔ اندر نے بزم کھیلتے وقت بلف سے کام لیا ہوگا۔

زینتی نے کہا: "صاحب کل ہم وٹر پنچ پائیں گے۔"  
"جھیل وٹر کیا بہت خوبصورت ہے؟"

زینتی سر ہلاتے ہوئے بولی: "جی صاحب! جد ہر نظر اٹھاؤ پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل تک، چاروں طرف نیلا پانی اور پنچ میرے کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے اور سری بٹ ناگ۔  
"سری بٹ ناگ کیا؟"

• بٹ ناگ وڈر کا دیوتا ہے۔ وڈر کا بادشاہ ہے۔ وہاں ہر ایک  
سیاح کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان یا انگریز، کچھ نذر دینی پڑتی ہے :  
• اور اگر وہ مذہب سے ؟

• تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے ۔

• اچھا..... تو کیا جھیل وڈر بہت خوبصورت ہوگی ؟

• صاحب خود دیکھ لیں گے ۔

• تم سے بھی زیادہ خوبصورت ؟

میں نے زینتی کے قریب جا کر کہا :

زینتی کا چہرہ جو پہلے ایک سید کے پھول کی طرح تھا۔ اب  
ایک گلاب کا پھول بن گیا، اس نے شرما کر اپنا منہ موڑ لیا ۔

میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا ۔  
اور زینتی کے ہاتھ میں دیدیا ۔ اور جذبات سے گلو گھر آواز میں کہا ۔  
• یہ لو اسے سری بٹ ناگ کی نذر کر دینا ۔

چند لمحے خاموشی رہی ، پھر یک سخت زینتی چپو چھوڑ کر تن کر  
کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری طر تیز نگاہوں سے دیکھا۔ گلاب  
کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کاٹتے ہوئے  
نوٹ کو زور سے اپنی سٹشی میں سل ڈالا۔ اور پھر اسے تیزی سے پانی



میں پھینک دیا۔ زینبی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں  
نم دار ہو گئی تھیں اور بالوں کی ایک لٹ واسنے رخسار پر اُتر آئی تھی۔

یہ زینبی کی دوسری تصویر ہے جو آج تک میرے ذہن میں  
محفوظ ہے۔ میں آج بھی آنکھیں بند کئے چشم تصور سے اُسے ایک  
شعلہ جوالہ کی طرح بھڑک اُٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔

میں دیر تک بچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا محبوب  
اور پشیمان، اپنی شکست کی زخمی تصویر، لوٹ چکر کاٹتا ہوا، پانی  
کی سلج پر بہ رہا تھا۔ آخر اسے ایک مچلی نے نگل لیا۔

آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصہ میں شفق کی لالہ گول  
لہریں غائب ہو گئیں اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چُن دی  
گئی۔ ان تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی۔ کہیں  
کیا تم زینبی کو بھی ایک مچلی سمجھتے تھے۔ وہ مچلی جو تمہارے پانچ  
روپے کے نوٹ کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر چپ چاپ نگل  
جاتی۔ لیکن وہ پانی کی مچلی نہیں آدم کی اولاد ہے۔ اُسے اپنے  
بے بڑے کی تیز ہے۔ وہ غریب ہے تو کیا ہوا وہ تمہارے روپوں  
کی محتاج نہیں۔ تم اسے نہیں خرید سکتے، کبھی نہیں خرید سکتے،

دوسرے دن ہم ڈاکر کے کنارے پہنچ گئے۔ اور ہم نے

اپنے ڈرنگے کو وہاں بندھوایا جہاں دریا نے جہلم جھیل ووتر میں داخل ہوتا ہے — حد نظر تک، سمندر کی طرح نیلا پانی پھیلا ہوا تھا اور دُور بہت دور چاروں طرف ایک سلسلہ کوہ ایک نیلگوں دیوار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مرقابوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھیل کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پر بچوں کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے کس سی نظر آرہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی۔ ورنہ اگرچہ ہوا زور کی چل رہی ہوتی، تو اس جھیل میں بیس بیس فٹ کی لہر کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا۔ اور پھر پانی کی ان طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں۔

لیکن اگرچہ موسم سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے، ہوا بالکل ساکن رہی اور جھیل کی سطح نیلے رنگ کے شیشے کی طرح بالکل شفاف اور غیر متحرک، ہم نے سری بٹ ناگ دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا بجنور تھا جو جھیل کی مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بناتا ہوا گھوم رہا تھا اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا لیکن ہم نے کشتی کے ملاحوں کے کہنے پر بھی ووتر کے اس بے تاج بادشاہ کو ایک پسیر تک نذر دینا گوارا نہ کیا۔ اور پھر موسم نے سری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھٹا سا بجنور تھا اور پہلے

بھنور سے قریب چار میل کی دوری پر واقع تھا۔ البتہ یہاں گورنمنٹ نے جو تیز ناکم جانتا تھا۔ ایک دو ناشپاتیاں وزیر کی نذر کیں جو خدا جانے کتنے آدمیوں سے بھوکا تھا۔ کیونکہ ملاح کے کچنے پر بھی معلوم ہوا کہ آخری حادثہ آج سے دو مہینے پیشتر تین انگریزوں کو پیش آیا تھا۔ جو اس جہیل میں کشتی چلا تے چلا تے ان طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے۔ جو فی الفور ایک تیز جہاز کے چلنے سے پیدا ہو گئی تھی۔

سب پہرے بعد جب ہر جہیل کی سیر سے لوٹے تو زین اور عزیزا دونوں کو زار و قطار روئے ہوئے پایا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ زین کا خاوند سوپور سے پنجاب چلا گیا ہے۔ روزگار کی تلاش میں۔ ایک آدمی سوپور سے آیا تھا۔ وہ ادھر سے گزر رہا تھا اور اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا۔

ہم نے زین اور عزیزا کو جہاں تک ہو سکا تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے۔ اور بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے۔

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی۔ یہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اس بیوقوف کشمیری کو

اس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا تھا ؟ پنجا ب میں اسے  
کیا قارون کا خزانہ مل جائے گا ؟

گدھے ؟ بیوقوف غریب ، ان میں حقل تو بالکل نہیں ہوتی  
محض بوجہ آٹھا نا جانتے ہیں ، نچروں کی طرح ، انہیں انسان سمجھنا ہی محنت  
ہے۔ ان کی ساتھ نچروں کا سا ہی سلوک ہونا پڑتی ہے۔ غریب لوگ غریب  
ہی رہیں تو ٹھیک طرح کام کرتے ہیں۔ اگر انہیں پیٹ بھر کر کھانا  
ملنے لگے تو اکڑ جاتے ہیں۔ غرض کہ طبیعت بہت منقطع رہی۔

ہم سب لوگ اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہے تھے۔ اور  
یہ احساس ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آخر کھانا کھانے کے بعد  
بھیالال کے لطیفوں سے طبیعت کھی قدر بہلی۔ گوہر بخش نے گرامفون  
پر چند کھش ریکارڈ سنائے۔ اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے گوبخ  
اٹھی۔

دس بجے کے قریب جب برج ۰ شروع کی گئی، تو میں  
 دروِ سر کا بہانہ کر کے اُٹھ آیا۔ دراصل میں برج کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔  
 پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا، پھر میں نے کچن میں جا کر پانی  
 کا ایک گلاس پیا۔ لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی۔ میرے  
 کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پر آ گیا۔

زینتی ہاتھ میں چپو لئے ہوئے جھیل کے نیلے پانی کی طرٹ  
 دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی اور اس کے  
 قدموں میں عزیزا لیٹا ہوا تھا۔ نہیں، وہ رورو کر سو گیا تھا۔ اس کی  
 پلکوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے۔ اس کے لبوں سے  
 اب بھی کبھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی۔

اور زینتی ۔ وہ کیا سوچ رہی تھی ۔ کیا اس کی نظر  
 جھیل کی دستوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی  
 جہاں اس غلام پردیس میں شاید کسی لکڑی اور کوئلے کی دکان کے  
 آگے اس کا خاوند لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کی محنت و مشقت سے چڑ۔  
 ایک تھکے ہوئے نچر کی طرح ہانپ رہا تھا۔ زینتی کا چہرہ ادا تھا۔ اس  
 آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھ رہی ہو  
 ” زینتی ! میں نے آہستہ سے کہا۔  
 وہ خاموش بیٹھ رہی۔

” مجھے بہت افسوس ہے زینتی ۔“  
 زینتی کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا۔  
 ” زینتی تم گھبراؤ نہیں ۔ میں نے آہستہ سے کہا۔  
 ” صاحب، اب ہم کیا کریں گے ؟“ زینتی نے گلو گھر لہجہ میں  
 کہا۔ ” اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں — ایک خاوند تھا۔ وہ پردیس  
 چلا گیا۔

” عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے ۔۔۔۔۔  
 ” میں عورت ذات ہوں ۔۔۔۔۔۔  
 ” اے اب کیا ہو گا ؟“

زینی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں، میں اس کے قریب جا کھڑا  
ہوا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

”کیوں گھبراتی ہو، زینی متارا غاوند ضرور پردیں سے واپس  
آجائے گا۔ اور —“

زینی نے روتے ہوئے کہا۔ ”صاحب میں مرجاؤں گی  
اور چوٹا عزیز یا جی بھوکا مر جائے گا۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا۔“

”مست گجراؤ زینی، میں تمہارے لئے..... میرا مطلب  
بے میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ہاں تم روتی کیوں ہو؟  
میری اچھی زینی مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے بے اندازہ محبت  
میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں.....“

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا  
ایک نوٹ غما دیا۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند،  
لپک پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک  
پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی کچھ گھٹی تیل ختم ہو چکا تھا اور پھر غریبوں کے  
پاس سرمایہ ہوتا ہی کہاں ہے۔ زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح  
میری آغوش میں گر پڑی۔ اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے  
کو میرے بازوؤں میں چھپالیا۔ اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔

پانڈ کا نگ بھسکا چڑ گیا تھا۔ سارے نام تھے۔ وہ جہلم کی  
 سلج پر باسی چوڑوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کنول کے پتوں  
 کے قریب سے گزرتی ہوئی آئیں بھر رہی تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ سر جھکا کر  
 اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ تم نے ہمیں خرید لیا۔ صرف ڈرائنگ روم سے  
 گورنمنٹ کے گلے کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ جھوم جھوم کر لگا  
 رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین اُست !!  
 نہیں است وہیں است وہیں اُست !



# بے رنگ و بو

سکھ دکاندار نے جو آٹا نون تیل بیچتا تھا۔ آہستہ سے کہا  
 • میرے مکان میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے، آپ خود چل کر دیکھ  
 لیجئے۔ کرایہ بھی کم ہے صرف نو روپیہ ماہانہ، میں خود آپ کے  
 ساتھ گلی میں چلتا ہوں۔“

سکھ دکاندار نے سائیکلوں کی دکان کے مستری کو آواز  
 دی۔ • اور جمو! اور جمو! ذرا میری دکان کا خیال رکھنا۔“  
 • کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب۔“

سکھ دکاندار جہاں رہتا تھا وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک ہی  
 منزل، ایک ہی نہانے کا کمرہ، سیڑھیوں کے قریب ایک چھوٹا  
 سا تنگ کمرہ خالی تھا اور اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف کھلتا ہوا

ایک چوڑا سا انگن۔

”بس، اس چوٹی سی جگہ کیلئے نو روپیہ مالانہ کرایہ۔“

سکھ دکاندار نے ایک ہلکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”تو اور کیا، ہم بھی نو روپیہ ہی دیتے ہیں: بجلی، پانی کے بل کا کرایہ

حاکم بارہ روپے ہو جاتے ہیں، مہینہ بھر میں بمشکل تیس پینتیس روپیہ کھاتا

ہوں، بارہ روپیہ مالک مکان کو دے دیتا ہوں۔ آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب

کی نذر کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، پیوی پنوں والے گھر میں آٹھ دس

روپے کچھ زیادہ نہیں، باقی..... باقی..... مشکل سے گزر جاتی ہے۔“

سکھ دکان دار کی دھند رو بیوی انگلی پر دھلے ہوئے فراک ٹھکانے

کو نکل۔ ایک بچہ اس کی دھوٹی کا گوشہ پکڑے روئے جاتا تھا۔ ایک بچہ نہ گود

میں اٹھائے تھے جو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتائے پکڑے

ہوئے تھا۔ ایک بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔

سکھ دکان دار نے کھانتے ہوئے کہا: ”تو یہ گھر آپ —

آپ کو پسند نہیں؟“

”جگہ تو اچھی ہے، لیکن ذرا — اس کمرے میں

اندھیرا بہت ہے۔“

سکھ دکاندار کی کمانسی تیز تر ہوتی گئی۔ آخر رُک رُک کر بولا۔

۔ ہاں ۔۔۔۔۔ اندھیرا ۔۔۔۔۔ اندھیرا، نور پے مالاند  
میں اندھیرا نہ ملے گا تو اور کیا روشنی مل سکتی ہے ۔



یہ گلی کچی تھی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دوسرے دروازے  
پھروں اور کھسیوں کو روکنے کیلئے جگہ جگہ قبضوں کی آوازیں، گرافون  
کے ریکارڈ، ہارمونیم کی صدا تیں، ایک مکان دیکھا، بہت بڑا مکان سرخ  
سیمنٹ کا فرش، تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے۔ صرف ایک  
حصہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا، خالی تھا کرایہ پندرہ روپے ۔

مجھ سے کسی نے کہا ۔ ” مالک مکان عقب کی گلی میں رہتے  
ہیں۔ آپ ان سے معاملہ طے کر لیجئے ۔ ”

عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف ان کا  
مکان تھا۔ گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے ۔  
نہتے ۔ ۔

۔ جی نہتے، آپ اس (لڑکے سے اشارہ کر کے) کمرے میں  
تشریف رکھتے ہیں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں بس میں ایک منٹ  
میں آجاؤں گا ۔ مجھے دفتر بھی جانا ہے ۔ ”

دوسرے کمرے میں ایک تگ پرانی وضع کے سونے پر جس پر نیلی چینٹ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ بابو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔  
 ”مجھے زکام ہے معاف کیجئے گا میں اُٹھ نہیں سکتی۔“  
 مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور کھشیری شال کو اپنے گرد پیٹتے ہوئے کہا۔

”میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کوئی ہرج نہیں مجھے بھی زکام ہے۔“  
 ہم دونوں ہنسنے لگے، بابو صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔  
 ہمیں ہنستے ہوئے دیکھ کر ان کے منہ کی مسکراہٹ پھٹکی پڑ گئی۔  
 ”آپ نے مکان دیکھ لیا؟ پسند ہے؟“ ان کے لہجہ میں خفیف سی درستی تھی۔

”دیکھ لیا، پسند ہے۔“  
 ”کرایہ ہر مہینہ ہم پیشگی لے لیتے ہیں۔“  
 ”اچھی عادت ہے۔“

لیکن ”بابو صاحب“ میری بات پر ہنسنے نہیں۔ بولے  
 کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ  
 ہوں گے، آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی؟ اور بچے بھی دیکھ  
 نامیاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔“

وہ ان دو فقیروں میں اپنی معاشرت کی پوری داستان گہریا۔  
 یہاں ۔ جس مرد کے پاس عورت نہیں اس کی نہ تو ملکتی ہو سکتی ہے اور  
 نہ اسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے۔ اور جس عورت کے پاس بچے نہیں  
 اس کا خاندان دوسرا بیاہ کر لیتا ہے اور اگر دوسری عورت بھی بچے نہ بنے  
 تو قیسرا بیاہ.....

میں نے انکار میں سر ہلایا۔  
 بابو نے اظہارِ انوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ • معاف کیجئے  
 گا۔ یہ بہو بیٹیوں والا حملہ ہے۔ •

بابو کی بیوی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں کمرے سے  
 باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب ایک جوان لڑکی بیل میں کتابیں لئے  
 کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے گال تمنا گئے۔ ادنیٰ آواز میں بولی۔  
 • مے منڈو جلدی کرو کا بج دیر ہو گئی۔ •

• آیا بی بی جی • نوکر ہنستا ہوا میٹرھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔  
 کوئی سولہ سترہ برس کا ہو گا، بیگی بیگی مسیں سڈول اعضاء



یہاں ریت اڑ رہی تھی۔ اور شور مچاتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر ہنسی  
 چدیک رہے تھے۔ ننھی مٹی لڑکیاں ریت پر لمبوں کی طرح چلنے کی کوشش  
 کر رہی تھیں۔ یا ایک لمبی سی پر کوڑنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ بچے ہوئے  
 چنے بیچنے والا یا اس انگیز نگاہوں سے ہجوم کی طرف دیکھتا ہوا گزر رہا تھا۔  
 اس ریتیلے میدان سے پرے دور سامنے ایک مکان پر موٹے حروف  
 میں لکھا تھا: کرایہ کیلئے خالی ہے۔

دروازہ کھلا تھا، ایک چھوٹا سا دالان، اس کے آگے کھڑا  
 آئینہ، جس میں پانی کے ٹل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بد صورت فرباندام  
 عورت نہا رہی تھی۔ بغیر کسی جھجک کے بولی: "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں"  
 میں نے دل میں کہا: "اور کیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں؟"  
 جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو۔ بولی: "اچھا  
 آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے میں بھی آتی ہوں۔"

وہ ایک سفید دھوٹی پہنے ہوئے آئی۔ یہ سونے کا کمرہ، یہ  
 بیچک، یہ ایک اور کمرہ، یہ بھی ایک کمرہ ہے۔ یہ رسوئی ہے، ذرا نا صاف  
 ہے لیکن کل تک بالکل — (سر ہلا کر) ہو جائے گی۔ کرایہ بیس روپے  
 ہم پیشگی لیتے ہیں۔ اچھے کرایہ داروں کو دیتے ہیں۔ دوسری منزل میں  
 ایک رائے صاحب کے گھر والے رہتے ہیں۔ ان کی تین لڑکیاں

میں کالج میں پڑھتی ہیں، تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی اور بچے . . . . .

میں نے پوچھا: ”اھ تیسری منزل سے اوپر؟“  
وہ حیران ہو کر بولی: ”تیسری منزل سے اوپر؟ — اس سے  
اوپر چھت ہے، سونے کیلئے کھلی جگہ، اھ ایک طرف ریف حجابات  
کے لئے تین کمرے۔“

”ہوں! میں نے کمپن کے فرش کو شوکر لگاتے ہوئے کہا:  
”یہ فرش ذرا ناسات ہے، کل تک — دسر ہاکھی —“  
پھر میری طرف دیکھ کر بولی: ”آپ شادی شدہ ہیں نا؟“  
”نہیں، لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہونگی، اور خالہ کی لڑکی اور  
خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔“

”اھ، اچھا — پھر تو خشک سے لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔  
کم از کم ایک دو مہینوں کیلئے، کئی کرایہ دار بغیر کرایہ ادا کئے رخصت  
ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں، بہن تمہیں ابھی پچھلے مہینے ہی آٹھ روپے کا نقصان  
اٹھانا پڑا۔“

اب یہ ایک نوجوان عورت چمکے سے کہیں سے نکل آئی تھی



اپنے نقش تھے لیکن چہرہ کچھ اُترا ہوا کچھ اُدا ہوا، بڑی بڑی آنکھیں  
لیکن طول، رنجیدہ، لبوں پر بھگی سی مسکراہٹ، لیکن چمکی، تاسف انگیز  
گو یا کہہ رہی تھی، اس سے کیا فائدہ، وہ دن بھر دفتر میں کلرک کرتے ہیں  
اور میں ہوں پر سرخی لگا کر برتن مانگتی ہوں، آخر اس زندگی سے کیا فائدہ  
وہ شام کو ننگے ماندے آتے ہیں اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتے  
ہیں اور رات کو — میرے لبوں کی سرخی دیکھتا ہی کون ہے ہلے  
یہ زندگی کس قدر چمکی اور بے مزہ ہے۔

”یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں“ مالکہ مکان نے مجھے بتایا  
ان کے — ”جل کے دفتر میں نوکریں۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ”جی بہت اچھا، نصیحتے جی۔“  
کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا: ”آپ — یہ مکان  
کرایہ پر لے رہے ہیں۔“

”جی سوچ رہا ہوں، میرے ساتھ خلاء ہوں گی، خالہ کی لڑکی  
خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں اور . . . . .“

”تو ہرج ہی کیا ہے؟ اس نے خود بخود ہنستے ہوئے کہا:  
”ہم سب بہنیں مل جل کر گزارہ کر لیں گی۔ گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے  
نا، اور پھر یہ بڑا اچھا مکان ہے۔“ اس نے کچن کے فرش کو پاؤں

سے بجاتے ہوئے کہا۔

”یہ فرش خدا کا سات ہے۔“ بد صورت فرہ اندام عورت

ایک کل کی طرح بول اٹھی۔ ”کل تک (سہرا کر) —“

میں آہستہ آہستہ باہر والاں کی طرف مڑنے لگا۔ نوجوان عورت

کی آنکھیں کبھ رہی تھیں، کیا ہی اچھا ہونا اگر تم یہ مکان لے لیتے۔ مجھے

تمہاری محبت تو درکار نہ تھی۔ اور میں اس قسم کی باتوں کو پسند بھی

نہیں کرتی لیکن یونہی دل بہلا رہا۔ وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں صبح

سے شام تک۔ تم کبھی کبھی گنگنیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے۔ اور میرے

لبوں کی سرخ چمک اٹھتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا، انسوؤں یہ زندگی کتنی چھکی

اور بے رنگ دبو ہے۔“

”میں کل تک آپ کو پتہ دوں گا، فستے۔“

”فستے!“ دونوں عورتوں نے کہا۔

♦ ♦ ♦

ریتے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر

رہا تھا۔ کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، مجھے گزرتے دیکھ کر رگ گھیا۔

”سلام صاحب۔“

• سلام! کہاں کے رہنے والے ہو، کشمیری ہو؟

• نہیں، صاحب، کٹو کا گدی ہوں۔

گورازنگ: تنے ہوئے پٹے، بہت سیلی بکڑ، پٹی ہوئی قمیص  
کشادہ بھاتی۔ اور ہاتھ میں ایک مضبوط کلکھاڑی۔

• کٹو، کٹو؟

• جی سرکار۔

• بیوی ہے؟

گدی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ • جی سرکار۔ بیوی کے  
نام پر ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، کیا ہوا اگر وہ  
غلام بنے کم از کم اس کا بھی تو ایک غلام ہے۔

گدی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا۔ اس کے  
بڑے بڑے میلے دانت سرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر چڑے ہوئے  
معلوم ہوتے تھے۔

• بچے بھی ہوں گے؟

• جی سرکار ایک لڑکا ہے۔ ننھا سا دانت سے اشارہ کر  
کے، اتنا سا۔

• آغیوں بھی ساتھ لائے ہو؟

گدی کی مسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو۔  
اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلادیا۔ بولا۔ "صاحب کوئی کام  
دیجئے میں لکڑیاں خوب چیرتا ہوں۔"

"ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آنہ؟"

"ایک آنہ؟ صرف ایک آنہ؟ ارے — صرف ایک  
آنہ؟ آدھے دن کی کھائی۔"

"سرکار لوگ ایک آنہ بھی نہیں دیتے۔"

"تم واپس کلو کب جاؤ گے؟"

لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا۔ اور مختصر پینے کا شاپہ  
وہ دھویں کے حلقوں میں کلو کے سبز مرغزار پر فانی چوٹیاں کالی  
سیٹ کی چھتوں والے گاؤں اور اپنی بیوی اور ننھے بچے کی تصاویر  
دیکھ رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا۔ لکڑ مارے نے اس انگیز لہجہ میں کہا۔

"صاحب، کوئی کام بتائیے؟"

\*\*\*

شام کو میں پھر اپنے سرائے فائبرسٹل کے دروازے پر

واپس پہنچ گیا۔ قید خانے کی طرح تنگ کمروں کی قطاریں، بجٹی ہوئی پیاز کی بو، بڑے سے آگن میں بے ترتیبی سے پھے ہوئے پنچ، آٹھ دس لوگوں کے مجمع میں راج ہنس چلا پڑا کر کبہ رہا تھا۔

”ہم انقلاب چاہتے ہیں انقلاب، بورژوا، عمومی انقلاب اور پھر اشتراکی انقلاب اور پھر خالص سوفیصدی مارکسی انقلاب ہم ایک نئے تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بنیاد پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں ہم.....“ بچاؤ ساج ہنس، مبلغ کا ملازم میرے قریب سے گزر گیا۔

”میں پکارا۔“ او دینے! آج کیا پکا ہے؟“  
”ساگ، دال اور کانشی پل۔“

۹، نمبر میں رہنے والا برہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے ہاتھ روم میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

راج ہنس اپنی پتی آوازیں اب تک چلا رہا تھا۔ ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اسے پیس کر دھر دیں گے۔ اس کے پرچے.....“

بھیا لال کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ادا اس لمبہ  
 میں پوچھا۔ تم نے مکان لے لیا؟ اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے  
 جاؤ گے؟ اپنے سب رفیقوں کو؟  
 میں نے جواب دیا۔  
 ”میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے۔“



# آنسوؤل والى

مہم دونوں تریٹ کے ڈاک بنگلے میں آرام کریوں  
 پر لیٹے اڑکھ رہے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ اور  
 بند درتے کے شیشوں میں سے میں برف کے ان بڑے بڑے  
 سفید گالوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جو سیب کے پھلوں کی طرح خوبصورت  
 تھے۔ اور نہایت خاموشی سے دریائے جہلم میں گر رہے تھے۔  
 جہلم میں پانی ہر لمحہ بڑھ رہا تھا۔ دریا کے کناروں پر درخت برف کا  
 سفید لبادہ اوڑھے چپ چاپ کھڑے تھے۔ چاروں طرف  
 ایک عجیب خاموشی، ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم  
 ہوتا تھا کہ شاید ہم کسی پریوں کے ملک میں آگئے ہیں۔  
 میرا ساتھی جو انجینئر تھا، یکا یک آرام کرسی پر اُٹھ بیٹھا



اور میری طرف جھک کر کہنے لگا۔ "کیوں دوست کیا تمہیں جادو، سحر و افسوں اور اس قسم کی باتوں پر یقین ہے؟"

میں نے خوابیدہ انداز میں سر ہلادیا۔ انجینئر کا چہرہ مجھے بس مگر پُر مسرت ایام کی یاد سے چمک اٹھا۔  
اس نے ایک سنگار سلگایا اور کہتے لگا۔ میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

• ایک دفعہ مجھے سہرہ اور گائیاں کے درمیان جھولنے کے علاقے کی طرف، ایک خراب اور گچی سڑک کا معائنہ کرنے کیلئے جانا پڑا۔ یہ سڑک پہاڑوں کو کاٹ کر بنی تھی۔ بھائی گنی تھی۔ اور مجھے جلد از جلد معائنہ کر کے اس کے متعلق اپنے افسروں کو مطلع کرنا تھا کہ آیا یہ سڑک خشک موسم میں موٹروں کی آمد و رفت کے لئے موزوں ہے ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔

افسر لوگ بھی اس سڑک کے لئے بہت بے قرار نظر آتے تھے۔ کیوں کہ یہی وہ سڑک تھی جو گائیاں کی خاموشی اور پُر سکون وادی کو باہر کی دنیا اور اس کی تہذیب سے ملاد رہی تھی۔ یہ سڑک کوئی ایک سو ستر میل لمبی ہوگی اور سہو سے گائیاں تک جاتی تھی۔ میں نے اپنا معائنہ سہرہ سے شروع کیا۔

سہو ایک خوشنما جگہ ہے۔ چوٹی چوٹی گول گول پہاڑیاں  
 چوٹیوں پر کہیں صنوبر کے درخت آسمان کی شفاف اور نیلی سطح پر سیاہ  
 سائے بناتے ہوئے، پہاڑیوں سے نیچے اتر کر ایک سبز اور شاداب  
 سطح مرتفع اور اس پر چند ایک بھوری بھوری جھونپڑیاں جو آفتاب کی  
 کرنوں میں کندن کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہاں سہرہ واقعی ایک اچھی  
 جگہ تھی اور میں نے اُسے بہت پسند کیا۔ سوائے سہرہ کی چنگی کے  
 جہاں کے افسر مجھے نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھے حق  
 کرنا ہی مناسب سمجھا کہ ایک محالدار مجھ سے کہنے لگا۔ صاحب آپ کے  
 اس بیٹ پر بھی محسوس لگے گا۔ میں نے کہا: "بھئی یہ تو پہننے کی چیز  
 ہے۔" وہ بولا: "ہاں ہے تو سہی، لیکن بالکل نئی نظر آتی ہے۔"  
 دراصل چنگی کے افسر پہننے کی چیز اسے سمجھتے ہیں جو نئی نہ دکھائی دے  
 نہ دھلائی گئی ہو، بلکہ اچھی خامی گندی اور ناصاف ہو۔ حصول صرف  
 اسی صورت میں معاف ہو سکتا ہے۔

خیر ہر سہرہ سے کوئی دس بجے کے قریب آگے  
 چلے، اب ہمارے سامنے وہ سڑک تھی۔ جو بیچ در بیچ بل کھاتی ہوئی  
 نئے اور اجنبی علاقوں میں سے گزرتی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس  
 ہوا کہ میری کار بھی پہلی مرتبہ اس علاقے میں داخل ہو رہی تھی اور

اس سے مجھے یک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔

میں نے خوفِ سرے کہا۔ کہ گاڑی آہستہ آہستہ چلائے۔ کیونکہ  
اول تو مجھے معائنہ کرنا تھا۔ پھر سڑک بھی اکثر مقامات پر بہت تنگ  
تھی۔ کہیں کہیں کناروں پر گہری کھائیاں آجاتی تھیں۔ جن کی طرف  
دیکھنے سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، اہ اکثر  
موڑ بہت غلط طریق پر کئے ہوئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے  
گئے۔ میلوں ہی آگے، سڑک کا مسابینہ کرتے ہوئے قدرت کی  
دلفریبیوں کی بہار دیکھتے ہوئے۔ دور اوپر آسمان میں چلیں پرتولے  
ہوئے گھوم رہی تھیں۔ نیچے زمین پر لمبی لمبی گھیتیاں پہاڑوں کے دامن  
سے شروع ہوتیں اور پھر کسی پرانے قلعے کی سیڑھیوں کی طرح اوپر ہی  
اوپر چڑھتی چلی جاتیں۔

کبھی کبھی کوئی دست کا درخت اپنے سرخ سرخ پھولوں  
کی شمعیں لٹکائے ہماری موٹر کے قریب سے دوڑتا ہوا گزر جاتا۔  
ایک جگہ ہیں ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کرنا پڑا۔ جہاں کم غبت نسب  
انجینئر مل تو کیا ایک DIVERSION تک بنانا بھی بھول گیا تھا۔ ہم  
نے اس چھوٹی سی شور مچاتی ہوئی ندی کو کار کی پوری رفتار سے عبور  
کیا۔ پانی میں سے گزرتے وقت انجن سے نئے نئے ٹپکنے لگے۔ اور

گاڑی کے پھٹے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر ناپتے ہوئے گزر گئے۔ موسم خزاں کا تھا لیکن یہاں کی خرواں بھی کتنی حسین تھی۔ کشمیر میں گالیاں سے زیادہ خوبصورت واوی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

میں نے خزاں میں بہار کے گیت گائے۔ میں نے اپنے شو فر کو گاڑی اچھی طرح چلانے پر مبارکباد دی، میں نے —  
 یکا یک ایک دمچکا سا لگا، جس سے ساری کار کانپ اُٹھی۔ پچھ  
 ایک اور دمچکا اور اب کار وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ خاموش اور  
 چپ چاپ، صرغ انجن ہی ایک پھلٹے ہوئے بھڑکے پتے  
 کی طرح چلا رہا تھا۔

ہم کار سے اترے، میں اور میرا ہوشیار ڈرائیور ایک  
 اچھتی ہوئی نگاہ سے ہم نے دیکھ لیا کہ کار کو کیا حادثہ پیش آیا تھا  
 چپ چاپ یہ کم بخت پتی سڑک درمیان میں سے بیٹھ گئی تھی۔ اذ  
 کار کے پچھلے بائیں پہیے کو اپنی جگہ سے ہلا گئی تھی۔ میں نے ڈرائیو  
 کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمیں یہیں سڑی میں رات بھر ٹھہرنا  
 ہو گا۔ اتنا کہہ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اسی وقت مجھ پر وہ  
 احساس طاری ہوا جسے آپ سحر یا بادو یا انمول، جو جی چاہے کہ  
 کر پکار سکتے ہیں۔

یہ ایک تنگ وادی تھی جس کے دونوں طرف نیم دائروں جیسے  
 ہوئے اوپنے اوپنے پہاڑ کھڑے تھے۔ وادی کے مین درمیان پہاڑوں  
 کو چیر کر ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی ڈوبتے ہوئے سوج  
 لی شاعروں میں ایک سونے کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ ہمارے بالکل  
 قریب ہی دیو وار اور شاہ بلوط کے درخت کھڑے تھے۔ خاموش  
 چپ چاپ، جنگل کے سپاہی جو شاید عشق و محبت کے وہ حیرتناک  
 فسانے سن رہے تھے جنہیں مغربی ہوائیں دور دور کے ملکوں سے  
 اٹا کر لائی تھیں۔ پرے جنگل کے قریب ایک خوبصورت گھر تھا۔  
 پکنی مٹی کا بنا ہوا۔ اور سپید کھریا سے لپا ہوا۔ اس کے قریب ہی نیچے  
 سڑک کی طرف، ایک عالی شان چنار اپنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔  
 جس کے گھنے سائے میں ایک ٹھنڈا چشمہ لگنا رہا تھا۔

اس حسین منظر نے مجھ پر ایک بخود کی کیفیت طاری  
 کر دی۔ اور میں وہیں سڑک کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ پھر لیکا ایک ڈرائیو  
 کے یہ تلخ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھے۔

”صاحب انوس ہے، مگر ہم آج آگے نہیں جا سکیں گے۔“

میں نے یہ سن کر منہ موڑ لیا اور چشمہ کی طرف چل پڑا۔

چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور صاف تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا

اور خوب سیر ہو کر پیا۔ اس کی جاں بخش تازگی نے اس درد کو بھی دور کر دیا جو سفر کی تکان کی وجہ سے میری کھن ٹپیوں میں پیدا ہو گیا تھا۔  
 "پانی ٹھنڈا ہے راجی۔" ایک نازک آواز آئی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ایک عورت تھی جو اپنے داہنے بازو اور کمر کے درمیان ایک مٹی کی ٹھلیا تھا۔ اسے تھی۔ اس طرح جیسے کوئی ماں اپنے ننھے ننھے بچے کو تھا۔ ہوتے ہو۔ وہ کسی قسم کی آہٹ پیدا کئے بغیر ایک وحشی ہرنی کی طرح یہاں چشے کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی ایک ہرنی کی سی وحشت اور نرمی پائی جاتی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور تعظیم کے طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "جی ہاں پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے ایسا چشمہ تو میں نے اس علاقے میں کہیں نہیں دیکھا۔"

اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولی۔ "تم مجھے اس علاقے کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے؟ میں نے مسکین بچے میں کہا۔ "کاش کہ ایسا ہوتا۔"

اس کے پتے پتے لبوں پر ایک لرزش سی پیدا ہوئی کہنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے جو اس جنگل کا رہنے والا نہیں ہے وہ

اس جگل کا رہنے والا کیسے ہو سکتا ہے ؟

میں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا اور اس کے نازک ٹخنوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ننگے پاؤں کی طرف بلاشبہ میں اس جگل کا رہنے والا نہیں تھا۔

وہ کچھ عرصہ خاموش رہی۔ پھر اس نے نیچے سڑک پر کھڑی ہوئی کار دیکھ لی۔ ”وہ کیا ہے، کیا یہ وہی چیز تو نہیں جس سے متعلق میرے باپ نے کہا تھا کہ ایک دن یہاں آئے گی اور اس سب علالتے پر قبضہ کر لے گی۔“

میں نے وحشی ہرنی کو سمجھانے کی کوشش کی

جب وہ میری باتیں سن چکی تو سر ہلا کر کہنے لگی، ”اوں ہوں یہ کوئی اچھی چیز نہیں، ایک گھوڑا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بُرے دن آ رہے ہیں۔“  
 یہ کہہ کر وہ چشے کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے مٹی کی ٹھلیا کو چشے میں پھینک دیا۔ اور اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اُسے ننھے ننھے بچکولے دینے لگی۔ جیسے کسی کھلونے سے کھیل رہی ہو۔ اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں جیسے کوئی عجیب سا پنا دیکھ رہی ہو۔ وہ کیا سوچ رہی تھی جگل کی حین شاعرو،

جب وہ اس طرح چٹھے کے کنارے اپنے خیالوں میں مست ٹھلایا  
 کو اپنی انگلیوں میں تھامے سوچ رہی تھی۔ تو یکایک سوجھ کی آغری کرئیں  
 اس کے چہرے پر پڑیں، ان کندنی کڑوں کے جھلکاتے ہوئے انحرافی  
 ہلے نے اس کے چہرے کو اور بھی حسین اور پُر اسرار بنا دیا۔ اور یکایک  
 مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ بلکہ خود جھگل کی دیوی  
 تھی۔ جسے ایک حقیر انسان نے دنیا نے جہذیب سے بہت دُور  
 ایک نیلے چٹھے کے قریب بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ ہاں وہ جھگل کی دیوی  
 ہی تو تھی۔ خوب صورت، پُر اسرار، وحشی، گمنام اور محسوس !  
 ٹھلایا دیر تک چٹھے میں ناچتی اور گنگناتی رہی۔ اور آخر کار  
 پانی سے بھر گئی پھر یکایک اس کی مالک بھی اپنی خوابوں کی دنیا سے  
 اس غیر دلچسپ اور چمکی دنیا میں لوٹ آئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے ؟"

اس نے جواب دیا۔ "نیرا۔" یہ کہہ کر اس نے نگاہیں  
 نیچی کر لیں اور ایک ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ؟" میں

نے اس سے کہا۔ آپ کا نام تو بہت اچھا ہے نیرا، نیرا یعنی  
 آنسوؤں والی، گو میں آپ میں رونے کی کوئی بھی کیفیت نہیں دیکھتا۔



سوائے آپ کی آنکھوں میں جن کی ملائمت اقد زہی کس ہرنی کی آنکھوں ،  
کی یاد دلاتی ہے ۔

اس پر وہ اور بھی شرمائی ، شاید اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی  
پھر وہ آہستہ سے کھڑی ہو گئی ، اس نے ٹھلٹھا پانی سے نکال کر اپنے سر پر  
رکھ لی اور اپنے دونوں بازو اس کے نیچے باندھ لئے ۔

میں نے آہستہ سے کہا ۔ ” کیا ہمیں بات بسر کرنے کیلئے  
کوئی جگہ مل سکتی ہے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ۔ میرا شوفر بھی میرے  
ساتھ ہی ہے ۔ “

نیرا نے فوراً جواب دیا ۔ ” کیوں نہیں ، بینک میرے بابا آپ  
کو ضرور جگہ دیں گے ، آئیے ۔ گو ہم بہت غریب لوگ ہیں ، لیکن یہاں او  
کوئی رہتا بھی نہیں ، میرے ساتھ آئیے ۔ “

دو دن کے بعد مھر کے دھندلے میں ، اسی سڑک کے کنارے  
میں اور نیرا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے ۔ ڈرائیور نے آخر کار  
کار کو درست کر لیا تھا اور اب ہم الوداع کہنے کیلئے تیار کھڑے تھے  
میں نے نیرا کے ہاتھ ملنے ہاتھوں میں لے لئے اور نہایت حسرت  
سے اُسے الوداع کہی ، نیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ ہاں وہ آنسوؤں  
والی تھی ، نیرا ، دو دن ہم دونوں نے اکٹھے گزارے وہ ایک پاک

نصاف اور مصوم ہستی تھی، جیسے کہ صرن جنگل کے رہنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ دو دن، دو خوبصورت خوشیوں سے بھرے ہوئے دن میں نے نیزا اور اس کے والد جنگل کے بوڑھے شکاری کی سادہ اور حسین زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ دو دن، جو سرت انروز لمحوں کی طرح جلد ہی ختم ہو گئے۔ ان دو دنوں میں نیزا نے مجھے اپنے چھوٹے سے باغچے میں کھلے ہوئے پھول دکھائے، اپنی کیریاں، گائیں اور دھان کے کھیت اور میں نے؟ — میں نے اُسے جن صحبت کے افسانے سنائے اور سیاہ دلوں کی ابد فریبیاں بیان کیں۔ میں نے اُسے بہت سی باتوں کے متعلق خبردار کیا۔ کیونکہ وہ بہت ہی مصوم تھی۔ خطرناک حد تک مصوم، سب سے بڑھ کر میں نے اسے اس چیز کے متعلق خبردار کیا جسے لوگ تہذیب کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔ تہذیب جو اب جلد ہی اس سڑک کے ذریعے اس علاقے میں پھیلنے والی تھی وہ نہایت خاموشی سے میری باتوں کو سنتی، ایک آہ بھر کر میرا شکریہ ادا کرتی اور پھر چپ ہو جاتی۔ اور اب ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے۔

میں نے چوتھی بار اس سے کہا: "اچانرا الوداع۔"  
 اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے کوٹ کو پکڑ لیا: مت

جاؤ پر پرسی کیا تم ضرور چلے جاؤ گے؟

سچ پچ اس غریب لڑکی کو مجھ سے انس سا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ نرم ہجے میں کہا: میں تم سے ملنے کیلئے آؤں گا۔ نیرا، ضرور، ہاں اب مجھے اجازت دو۔ اپنی دلکش مسکراہٹ کیساتھ مجھے الوداع کہو، نیرا۔

نیرا اپنے آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ سحر کے اُڑتے ہوئے دھندلکے میں میں نے دیکھا کہ نیرا کی پلکوں پر آنسو پھول کی پتیوں پر شبنم کے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے الوداع کہی اور پھر ایک سخت منہ موڑ کر سامنے کی گھائی پر چڑھنے لگی۔ اوپر اور اوپر، وہ گھائی کے اوپر چڑھتی گئی۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے نہ مڑ کر دیکھا۔ گھائی کی چوٹی پر سوچ کی کرنوں نے اس کی پیشانی کو چھوا۔

اور اس کے گرد ایک حسین ہالہ بنا دیا۔ اب وہ گارہی تھی ایک میٹھا پروسہ پہاڑی گیت جس کے الفاظ میرے کانوں نے نہ سنے، لیکن جس جانتھو از نغمہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اس گیت کی وہ لہے، وہ اس کا لانا وال حسن۔

تڑپ اور درد آج تک میرے کلیجے میں محفوظ ہے۔

انجینئر چپ ہو گیا، کمرے میں کتنی دیر تک خاموشی طاری رہی۔

آگ جلم ہو چکی تھی اور دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناپ رہے تھے۔ بہت  
 دیر کے بعد میں نے آرام کر سی سے سر اٹھایا۔ اور انجینئر کی طرف مڑ کر  
 پوچھا: کیا تم پھر بھی میرا سے ملے؟  
 لیکن انجینئر سو گیا تھا۔ اس کا سگارا اس کے ہاتھ کی انگلیوں  
 سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا۔ اور غایبچے پر جل کر رکھ ہو چکا تھا۔



# بچپن

رفیع کو نیلا سے بہت محبت تھی، یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت  
 تھی، غرض نما رنگارنگ تیسریوں کو باغ میں اڑتے دیکھ کر اس کا دل  
 یکا یک بیتاب ہو جاتا۔ اور وہ ان کے پیچھے خوشی کی دھیانہ چھین مارتا ہوا  
 پولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا، اور جھٹ سے اپنے  
 پسندنے والی ٹوپی سر سے اتار کر لا جو ردی رنگوں والی ایک تیسری کو اس  
 میں قید کر لیتا۔ پھر آہستہ سے حیرت اور پیار بھری نگاہوں سے تیسری کی  
 طرف دیکھتا۔ اسے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک انگلیوں میں پکڑ کر ادھر ادھر  
 گھومتا۔ تیسری کے پر پھڑپھڑاتے اور یکا یک اس کا دل رحم کے جذبات  
 سے اتنا بھر جاتا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور وہ اُسے  
 ایک لمبت جھوڑ دیتا۔ تیسری اڑتی ہوئی دور سونف کے پودوں سے پس

شفالوں کے درختوں کی چوٹیوں سے گزر جاتی۔

رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اڑتی ہوئی خوبصورت تیسری کیٹریٹ  
دیکھتا۔ کتنی اچھی تیسری تھی۔ محبت اور افسوس، یکا یک ایک اور تیسری، سبز  
اور پیلے پیلے پروں والی پہلی تیسری سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں۔  
سنگد راج کے پھولوں کے اوپر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اور وہ اپنی چوٹی  
چوٹی ٹانگوں سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا سنگد راج کے تختوں کی طرف  
ووڑنے لگتا۔ اسے واقعی تیسریوں سے محبت تھی۔

اسے آؤؤں سے بھی محبت تھی۔ اور سیبوں سے بھی، اور  
لال لال رنگ کے مشرقی انگوروں سے بھی۔ جب درختوں پر سیب  
سونے کے گیندوں کی طرح چمکتے اور لمبی لمبی سبز بلوں میں پہاڑی  
انگور یا قوت کی طرح دیکھتے تو آغیں دیکھ کر رفیع کا دل کسی نامعلوم  
محوشی سے کانپنے لگتا۔ سرت دل ہی نہیں بلکہ ٹانگیں بھی۔ وہ چاہتا  
کہ وہ جلد جلد درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے۔ اور ہر ایک  
آؤ کو اپنے بکتر کی نخی نخی جیبوں میں بھر لے۔ ہر سیب کو، انگوروں  
کے ہر خوشے کو اپنے گالوں کے اندر یا شاید اپنے دل کے اندر  
چھپا لے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دنیا کا کوئی اور فرد اس کے سیبوں یا آؤؤں  
انگوروں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی اٹھائے۔ اُسے یقیناً ان

سے محبت تھی اور بائع کے مالی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔

اور پھر اسے اپنی اتا سے محبت تھی۔ جب اماں اتا کو کبھی جھڑک دیتیں اور اتا اس سے صورت بنائے آچل کے ایک کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ تو رفیع ادھر ادھر دیکھتا ہوا، سہم سہم کر قدم اٹھاتا ہوا بچے سے اتا کے کمرے میں چلا جاتا۔ اور اتا کے سیاہ لہنگے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اداس، معصوم اور پیار بھری نگاہوں سے اپنی اتا کی طرف دیکھتا۔ وہ اتا کو چپ کرانا چاہتا۔ وہ اُسے ڈھارس دینا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کیوں وہ کچھ نہ کر سکتا۔ پھر یکایک اس کا گلا بھرا آتا اور اتا کو روتے دیکھ کر وہ بھی بے اختیار سسکیاں لینے لگتا۔ پھر اتا اسے اپنی گود میں لے لیتی۔ اُسے اپنے بازوؤں میں زبردستی بٹینچ کر چپاتی سے لگا لیتی۔ اپنے گیلے زخار اس کے نرم نرم گالوں سے لگا دیتی اس کا منہ اتنی بار چومتی کہ اس کا دم رکنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ اتا کی سسکیاں بند ہو جاتیں۔ اور اس کے آنسو خشک ہو جاتے۔ ————— مل اُسے اپنی اتا سے محبت تھی۔

لیکن اتا سے محبت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُسے اُمّی اچھی نہیں لگتی تھی۔ امی تو اس کی جان تھی۔ لیکن وہ کیا کرے۔ اماں



ہی اسے ہر وقت اپنے پاس نہ رہنے دیتی تھیں۔ ہاؤتھے باغ میں  
کھیلو، جاؤ مٹے سکول جاؤ۔ رفیع سیر کو جاؤ۔

وہ جب دیکھتا، امی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتی۔  
امی کچن میں جائیں تو وہ پیچھے بھاگتا۔ اور کروشیا یا سلاٹیاں لے  
کر بیٹھتیں تو وہ صوفے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور امی کے بالوں  
سے کھینچنے لگ جاتا۔ اماں جھڑک دیتیں۔ "ننھے تم نے سبق  
نہیں یاد کیا۔" اور وہ سہم جاتا۔ "جاؤ کام کرو۔"

اور وہ دیمے دیمے قدموں سے واپس چلا جاتا۔ اُسے  
تو اماں سے محبت تھی۔ لیکن اماں ہی اُسے ہر وقت پیار نہیں کرتی  
تھیں۔ جب گھر میں مہمان عورتیں آتیں تو وہ محل جاتا اور بار بار اماں  
کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ لیکن اماں اسے یونہی چمکار کر کہہ دیتیں  
"رفیع بیٹا باہر کھیلو۔"

ہاں کبھی کبھی وہ اماں کی گھڑکیوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

اماں ملشتری اٹھائے ہوئے آبا کھائے کھانے کے کمرے میں  
تراشے ہوئے پھل لے جا رہی ہوتی کہ وہ ان کی ٹانگوں سے  
پٹ جاتا۔ شریر تھے، شریر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ  
اُردو کی تیسری کتاب اٹھائے ہوئے اماں کے ارد گرد شور مچاتا

ہوا جاگتا اور اٹھیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیتا۔ تھک کر اور مار کر وہ اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتیں۔ اماں کی میٹھی اور مہربان نگاہیں دیکھ کر وہ ان کی گردن سے لپٹ جاتا۔ "میری اچھی اتی۔"

وہ آبا جی کو بھی بہت چاہتا تھا اگرچہ اسے پتہ تھا کہ آبا بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور نرم بچے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ انہیں بہت چاہتا تھا۔ اگر وہ دور سے پر باتے تو وہ ہمیشہ منہ کرتا۔ "مجھے بھی ساتھ چلو آبا اے چلو نا آبا۔ اچھے آبا جی،"

آبا جی۔"

لیکن ان منٹوں سماجوں کا آبا جی پر ہمیشہ کم اثر ہوتا تھا۔ اور تو اور وہ شام کو سیر کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ چلے جایا کرتے۔ اور بچہ پار ر فیع چیتا ہی رہتا۔ آبا دور سے سے واپس آتے تو وہ کتنی دیر پہلے ہی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر آبا کی راہ دیکھتا رہتا۔ اور جب آبا دور سے ہی گھوڑے پر سوار ہندے کے قریب کی گھوڑی پر نظر آجاتے۔ تو وہ فرط مسرت سے چپٹا اٹھتا۔ آبا جی آئے۔ وہ آئے، وہ آئے، ہاں وہ آبا جی کو بہت چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اُسے نیلا سے ہی تھی۔ نیلا بیگم

فتح دین چہرہ اسی کی لڑکی تھی۔ عمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی شاید اسی وجہ سے وہ بچارے رفیع کی پرواہ تک نہ کرتی تھی ممکن ہے کہ کوئی اور وجہ بھی ہو۔ لیکن اس کا رفیع کو پتہ نہ تھا۔

بہر حال رفیع کو جتنی نیلا سے محبت تھی۔ اتنی ہی نیلا اس سے بیگانہ تھی۔ اس نے تو آج تک کبھی رفیع سے بات بھی نہ کی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ رفیع کے پاس سے گزرتی (اور رفیع کو ایسے موقعے بہت کم ملے ہوں گے) تو سر اٹھا کر اپنے خوبصورت گونگر والے بالوں کو چٹکا کر اس کے پاس سے گزر جاتی۔ غریب رفیع کو اس وقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اس چوٹے سے قصبہ کے ہر ننھے گڈ ریے سے ہنس نہنس کر بات کرتی تھی۔ مگر بچارے رفیع کو ہی یہ مسرت حاصل نہ ہوئی تھی۔

یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔ رفیع کی محسوس زندگی میں چند ایک ہی ایسے تکلیف دہ لمحے آئے تھے۔ ورنہ دن بھر تو وہ نیلا کو کم و بیش یاد بھی نہ رکھتا تھا۔ سکول کی قید، ماسٹر کی گھڑکیاں حساب کے سوال جمع تفریق ضرب تقسیم، باغ میں اچھل کود، رات کو وہ جب تنک کر بستر پر لیٹا تو بس پھر صبح اتنی ہی اُسے مشکل سے جگاتی تھیں۔

لیکن جب نیلا سانسے آجاتی یا جب باغ میں پھولوں سے اکیلا کھیلتا کھیلتا اکتا جاتا۔ تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کا خیال کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خود نیلا کو بلالے، بھلا وہ اسے کیا کہے گی۔ اچھا تو بھلا وہ اس سے ہی کیوں نہیں بولتی۔

ایک دن جب وہ یوں ہی کھیلتا کھیلتا ندی کے کنارے چلا گیا تھا۔ جہاں ندی پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ جاتی تھی۔ تو وہاں اس نے ایک تنگت کے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت سے اپنے مہم جوئی دیکھے۔ کئی پتلیں بڑھا رہے تھے۔ کئی بانسریاں بجا رہے تھے۔ کئی بھڑی ہوئی بھیڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس بلارہے تھے۔ دو تین ندی کے کنارے بنارہے تھے۔ اور ندی کے نیلے پانی میں تیرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف منوہر صادق حسنی نوراں کی تقری اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ریت کے شیلے کھود کھود کر عالیشان محل بنا رہے تھے رقیع بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا۔ ان میں نیلا بھی تھی۔ وہ بہت دیر تک ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں

نہ اس نے نیلا سے بات کی۔ نیلا نے اس سے، کیلتے کیلتے نیلا اور کنتھری جھولے کے قریب چلی گئیں۔ اور پٹنگ بڑھانے لگیں۔ رفیع حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے آج تک کبھی پٹنگ نہ بڑھائی تھی۔ اتنی اونچی اُسے تو جھولے پر بیٹھنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔ صادق ہانسی بجا رہا تھا۔ جڑک کر بولا: "پٹنگ بڑھاؤ گے۔" رفیع انکار نہ کر سکا۔ غاس کر نیلا کے سامنے جو دوسرے جھولے سے اتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رفیع ڈرتے ڈرتے جھولے پر چڑھا۔ لیکن اب اُسے پٹنگ بڑھانے کا ڈھب نہ آتا تھا۔ ناچار کہنے لگا: "مجھے جھولا دو۔" یہ سن کر بہت لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے۔ رفیع کو ایسا معلوم ہوا کہ نیلا کی ہنسی ان سب میں سے بلند تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا اور جھولے سے اتر کر سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور ادا اس جا رہا تھا۔ اسے کسی پر غصہ نہ تھا۔ صرف اُسے بار بار نیلا پر غصہ آ رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کی سبکیاں تیز ہوتی گئیں۔ اور جب وہ درجے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

• کیا بات ہے ؟ • اتانے پوچھا۔

• کیوں رو رہے ہو بیٹا ؟ •

• بیٹا رفیع کیا بات ہے ؟

• میرے رفیع کو کس نے مارا ہے ؟

• ننھے تم اتنی دیر کہاں کھلتے رہے یہاں بے چارا مالی

ڈیڑھ دو گھنٹے سے تماری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بولو  
رفیع ننھے ؟

لیکن تنہا رفیع دیر تک روتا رہا۔ آخر جب وہ چپ ہوا  
تو سسکیوں کے درمیان میں رُک رُک کر بولا۔

• میں ..... میں ..... ایک جھولا ....  
ایک جھولا لگوا دو اتنی ۔



نیلا رفیع کے ہاں کئی بار آئی کبھی امی سے مشائی

لینے کیلئے، کبھی کوئی کپڑوں کا جوڑا لینے کیلئے، کبھی کچے ہوئے  
آغروٹ دینے کیلئے جو اس کے گھر کے آنگن میں اُٹھے ہوئے  
درخت پر لگے تھے۔ لیکن رفیع اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بار  
رات کو سوتے وقت جب اتنا اُسے پریوں کی کہانیاں سناتی تو  
وہ سوچا کرتا کہ کیا پریاں نیلا کی طرح خوبصورت اور مغرور ہوا کرتی

ہیں۔ لیکن یہ بات اتنا سے پوچھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ نیلا اسے ایک مودت کمطرح پیاری لگتی تھی۔ کبھی وہ سوچتا اس کے گال کتنے لال لال ہیں۔ اور اس کے ہونٹ اس کے اپنے گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا۔ اچھا تو اگر وہ بھی نیلا کی طرح خوبصورت بن جائے۔ تو کیا پھر بھی نیلا اس سے ذبولے گی۔ یہ خیال اسے اس وقت آیا جب کہ وہ سنبلو کی ایک ادبھی جھاڑی کے قریب کھڑا ہوا پکے ہوئے سرخ سرخ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ ان سنبلوؤں کا رنگ کتنا سرخ تھا۔ سنبلو کھاتے کھاتے اس نے چار پانچ سنبلو توڑ کر اپنے گالوں پر مل لئے۔ اور اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو بالکل لال کر لیا۔ پھر یکایک اُسے دوسری جھاڑی کے قریب ایک خوبصورت تیتری دکھائی دی۔ اور وہ نیلا کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ وہ کتنی دیر تک تیتریاں پکڑنے میں مصروف رہا۔ آج اس نے سات خوب صورت تیتریاں پکڑیں۔ اور انہیں پھر اس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں سج کر لیا۔ اور انہیں گھر لے گیا۔

اماں نے پوچھا۔ "یہ منہ کیوں لال کر رکھا ہے۔ شاید آج پھر سنبلو کھاتے رہے ہو۔ میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے۔ کہ سنبلو نہ کھایا کرو۔ لیکن تم مانتے ہی نہیں۔ کیوں؟ ان بیماری تیتریوں

نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ؟  
جب رفیع کے ایک دو طاپنچے لگے تو وہ زور زور سے  
رونے لگا۔

حکیم کے دن فتح دین کی لڑکی حسب معمول ایک  
روال میں خوبانیاں باندھ کر رفیع کے گھر دینے آئی۔ رفیع گھر پر موجود  
نہ تھا۔ وہ باغ میں باڑ کے قریب چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے  
پھول توڑ رہا تھا۔ اور ہار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیلا جب خوبانیاں  
وہ کر باغ کے قریب سے گزری تو رفیع کو باڑ کے قریب بیٹھے  
دیکھ کر رُک گئی۔ وہ مزے سے ہار بنانے میں مشغول تھا۔

رفیع بچا رہے کو پتہ ہی نہ تھا کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے  
ایکایک نیلا نے باڑ سے ایک ٹہنی توڑی۔ رفیع نے سر اٹھا کر  
دیکھا۔ نیلا تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ اس نے ہار  
بنانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر باڑ کے قریب کھڑا ہو گیا۔

نیلا بولی۔ ”تمہارا نام بھی ہے ؟“  
”ہاں، رفیع۔“



” رہتی ! “

” رہی کیا نام ہے ؟ “ نیلا نے اپنی چوٹی سی ناک کو

اوپر اٹھا کر کہا۔

” رہی نہیں، رفیع ! “

نیلا بولی : ” میرا نام نیلا ہے۔ ہم وہاں رہتے ہیں (انگلی سے

اشارہ کر کے) وہ ان اخروٹ کے درختوں کے نیچے ۔ “

رفیع کہنے لگا۔ ” ہمارے ہاں منبلی کے پھول بہت اچھے

ہیں ۔ “

نیلا بولی : ” ہمارے ہاں خوبانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں “

رفیع کہنے لگا۔ ” ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی ۔ “

خوبانیاں ہیں۔ “

نیلا نے سر ہلا کر کہا۔ ” جھوٹ، ہماری خوبانیاں سب سے

میسلی ہوتی ہیں ۔ “

رفیع کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ” میں چنگ بڑھا

کتابوں۔ بہت ادبچی لے جا سکتا ہوں۔ “

” اچھا ؟ “ نیلا نے ایسے کہا جیسے اس کی بات پر

یقین نہ آ رہا ہو۔

”میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چڑھ سکتا ہوں۔“

”ہوں۔؟“

”میں — میں چنبیلی کے دربار ہوں۔ یہ دیکھو !“

نیلا بولی — ”ہم تم سے اچھے دربار بنا سکتے ہیں۔ اور ہر دکھاؤ

پھل !“

رفیع نے نیلا کا ہاتھ پکڑا اور اسے باڑ کے اس طرف لے آیا۔ پھر دونوں بیٹھ کر دربار بنانے لگے۔ دربار بناتے بناتے نیلا ہنسنے لگی۔

رفیع نے حیران ہو کر پوچھا کیوں ہنستی ہو؟ کیا بات ہے؟  
نیلا ہنستے ہوئے کہنے لگی . . . . . میں کہتی ہوں تم

دربار نہیں بنا سکتے اور کیا ؟“

رفیع کو جو غصہ آیا تو اس نے نیلا کے ایک طمانچہ گھا دیا۔ نیلا کہاں ہنس رہی تھی۔ کہاں اب زور زور سے رونے لگی۔ نیلا کو روتے دیکھ کر رفیع بہت پریشان ہوا۔ کیا کرے؟ کیا نہ کرے۔ اگر اٹی کو پتہ لگ گیا کہ اس نے نیلا کے طمانچہ لگایا ہے تو پٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ نیلا کی منتیں کرنے لگا۔

”اچھا نیلا جانے دو۔ مت رُو۔ میں کہتا ہوں مت رُو۔“

دیکھو میرے پاس تیسریوں کے تین سو پر ہیں۔ وہ اندر ڈبے میں بند رکھے ہیں۔ میں وہ سب تمہیں دے دوں گا۔ لو اب تم نہ رٹو۔ میں تمہیں ابھی لا کر دیتا ہوں۔“

رفیع دوڑتا دوڑتا گھر گیا۔ اور تیسری کے پروں والا ڈبہ لے آیا۔ اور ڈبہ کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا۔ کتنے اچھے پڑ ہیں۔ یہ دیکھو۔ دیکھو نا۔ نیلا مت رٹو۔ اور یہ سب پھل اور مار بھی تمہارے ہوتے رفیع نے ایک دو مار اٹھا کر نیلا کے گلے میں پہنا دیئے۔

نیلا روتے روتے ہنسنے لگی۔

کس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیلتے رہے۔ انہوں نے جھاڑیوں سے سنبلو جن جن کر کھائے۔ انگور کی بیلوں پر چڑھ کر سونے کی طرح چمکنے والے انگوروں کے خوشے توڑے۔

نیلا کے گھر میں آخر دھڑ کے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر قاضی کو لڑا۔ اور چپن کے دوسرے محبوب و مرغوب کھیل کھیلے۔ وہ ندی کے کنارے جا کر گڈیوں کے ساتھ ٹاپے..... پنگیں بڑھائیں بانسریوں کے گیت سنے۔ کبھی کبھی رفیع دو لہا بننا تھا۔ اور نیلا ڈھنسنے اور گھاٹی کے دامن میں ننھے ننھے گڈیوں کے براتی بنے ہوئے شہ جہاتے ہوئے کاغذ کی ڈالیاں بجاتے ہوئے بجا گتے پھرتے تھے۔

ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا۔ اور جب کبھی نیلا ہیل ہی کھیل میں شوخی یا مشارت سے کسی دوسرے گڈ ریسے کی دھن بن جانے پر آمادگی ظاہر کرتی تو رفیع بگڑ بگڑا ہوتا اور کھیل میں حصہ لینے سے انکار کر دیتا اور لڑائی پر تل جاتا یا نیلا سے روٹھ جاتا۔ روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے نیلا کو کسی کسی مستحق کرنی پڑتی تھیں اور بہت سخت سخت قسمیں کھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اس خوبصورت دادی میں دو ننھے دلوں نے پاک اور معصوم محبت کا ایک میٹھا، سہاؤنا اور پیارا سپنا دیکھا۔ وہ سپنا جو پہاڑی بھرنوں کے گیتوں کی طرح دل فریب تھا۔ وہ محبت جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند تھی۔ پھر کیا ایک رفیع کے والد کی تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی۔ اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ رفیع نے جاتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دے دی۔ جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہ ایک چاقو تھا۔ جس کا پھل بہت تیز اور چمکدار تھا۔ اور دستے پر رنگ برنگ کے سیپ لگے ہوئے تھے۔

اور نیلا..... ۹۰۰۰ نیلے بھی اپنی بہتر منکوں کی ملا جھے

وہ ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رکھتی تھی اتار کر رفیع کو دیدی۔ اور یہ سب کچھ چپ چپ کر ہوا۔ لیکن ٹھیک اس وقت کہ جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے۔ اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا۔ نیلا سسکیاں لیتی ہوئی رو پڑی۔ رفیع کا دل بیتاب ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس نے نہایت ہمت سے کام لیا۔ اس نے اپنے آنسو روک لئے۔ اور منہ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے جھاگتے ہوئے حب رہے تھے۔

تین سو سال اور گزر گئے۔ اور پھر ایک بار رفیع کے والد کی تبدیلی اسی حسین وادی میں ہوئی جہاں نیلا رہتی تھی۔ رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اٹھے۔ اور اس عہد کی محسوس خوشیاں اور اس زریں زمانے کی تمنائیں دل میں کروڑوں لینے لگیں۔ کیا وہ نیلا کو بھول گیا تھا؟ کیا کالج کی ہنگامی زندگی نے اس کے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی نہ رہنے دیا تھا؟ کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا۔ ان سب باتوں کا جواب شاید رفیع بھی اچھی طرح

سے نہ دے سکتا تھا۔ ہاں شاید وہ نیلا کو قریباً بھول ہی گیا تھا۔ لیکن بالکل نہیں، وہ سبز منگوں کی مالا ابھی تک اس کے پاس تھی۔ اور کسی قیمت پر بھی وہ اسے اپنے آپ سے جدا نہ کر سکتا تھا۔

کالج کے پُر مسرت لمحوں میں بھی اس نے اکثر نیلا کو یاد کیا۔ لیکن یوں ہی کبھی وہ اپنے بچپن کے دکھش کھیلوں کو یاد کر کے مسکرا دیتا۔ عجب زمانہ تھا۔ نہ ہاکی، نہ فٹ بال، نہ ٹینس، پھر بھی کتنی مسرت تھی، ان کھیلوں میں۔ اور نیلا وہ ننھی سی شوخ گڑیا ستلا کر باتیں کرتی ہوتی۔ ایک عجیب دکھش ادا سے ہنستی ہوتی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی تھپسیوں میں اس نے گھر آکر نیلا کو دیکھا۔ تو حیران رہ گیا۔ آخری بار جب اس نے نیلا کو دیکھا تھا۔ تو وہ ایک ننھی سی پری تھی۔ جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر روتی جاتی تھی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ پھر تیرہ سال تک اس کے تخیل میں نیلا کی یہ تصویر رہی۔ وہ خود لڑکپن سے شباب میں آگیا۔ اس کے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے باغ میں ہاشپاتیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت پتلے اور چھوٹے تنوں کے پودے تھے۔ آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بند کئے کھڑے تھے اور نیلا..... وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن جلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ کہ کوئی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ہاں یہ نیلا ہی تھی۔ سرو کی طرح بلند قامت، شباب کی رعنائیوں کا مرقع جمیل، اس کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ جو شاید سوچ کی کرنوں سے مل کر بنی تھی۔ اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا۔

رفیع اُٹھ کھڑا ہوا۔

نیلا بولی۔ ”تم نے مجھے پہچانا بھئی؟“

رفیع کے منہ سے نکلا۔ ”نیلا!“

نیلا ہنسنے لگی۔ وہی دلکش ہنسی، بچہ رفیع کو دیکھ کر کھلایا

مارنے اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور ہنسنے کے شانوں کو چھو کر کہا۔

”یہ تمہارا لڑکا ہے نا۔ کتنا خوبصورت ہے اس کا کیا نام ہے؟“

نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ ”ہاں، اس کا

نام ہے رچی، محمد رچی۔“



کتنی ہی دیر میں غاموش کھڑا رہا۔ اس کے پاؤں تلے

مین تھی اور دوسرے پر آسمان، وہ غلام میں گھوم رہا تھا۔ نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا۔ پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا۔ وہ چھوٹا سا تھا، ننھا رفیع، اور نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیریاں پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر جھکے سنبلو کھا رہے تھے۔ ندی کے کنارے اونچے تنگ پر بھولا بھول رہے تھے۔ گڈریے بانسریاں بجا رہے تھے۔ گڈریے براتی بنے ہوئے تھے۔ اور نیلا اس کی دُھن۔

بچے نے رفیع کے چہرے کی طرف اٹھ بڑھاتے ہوئے کہا "..... با..... با..... با....."

رفیع بچے کی طرف جھکا پھر اس نے آہستہ سے اپنی جیب کے اندر سے کوئی چیز نکالی، یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی۔ آہستہ سے اس نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی۔

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چھکنے لگے لیکن رفیع نے نہایت محبت سے کام لیکر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا اور نگاہیں اٹھا کر گھاٹی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔



# گل فروش

جب گل فروش کا بیٹا . میزنگ پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے  
بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا .  
" جا بیٹا نوکری تلاش کر ! "

بالکل اسی طرح بیسے قرون وسطیٰ کا ناول نویس اپنے  
قسطے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطہ صحرائی  
میں چھوڑ دیتا ہے . چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی . بیچارے لڑکے کے  
سائیکل چلاتے چلاتے ٹخنے زخمی ہو گئے . ہونٹوں پر پٹریاں جم گئیں  
وہ مصوم بچہ سا چہرہ کھلا گیا . مگر نوکری کہیں نہ ملی . گوہر مقصد نہ  
ہاتھ آیا پر نہ آیا .

آخر دارمان کر اور سائیکل کا ہینڈل توڑ کر گل فروش کے

بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا۔ ”آبا تو کڑی ملنا کچھ آسان نہیں۔“  
یہاں تو اس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں  
غریب کیا کروں ؟

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور ٹک ٹک کر  
بولی۔ ”کرنا..... کیا..... ہے ؟ دکان پر بیٹھ جا..... گل فروش  
کا بیٹا بھی گل فروش ہے..... بھول بیچ اور گزارہ کر..... مولوی  
ٹھیک کہتا تھا۔ اس لونڈے کو انگریزی ٹکیوں پڑھاتے ہو ؟ لمبے  
بال رکھے گا اور عورتوں کی طرح مانگ نکالے گا۔ کل سے یہ زلفیں  
کٹا دے اور ہار بنا..... سنا تو نے ؟“  
اتنا کہنے کے پانچ سال بعد بوڑھا گل فروش راہی دم ہوا۔



بوڑھے باپ کے مرنے پر گل فروش نے اپنی دکان اناں گل  
کے سرے پر کر لی۔ انگریزی تعلیم نے اسے جدت پسند بنا دیا تھا۔  
اس نے ہار اور بھروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کئے اور مشہور  
و معروف فلم ایکٹرسوں پر ان کے نام رکھے، گوہر آبدار، کبچن ادا۔

محل گارو۔ سلوچنا بار وغیرہ، اور بھی کہتے ہیں دلربا اور دلکش موسے  
 تھے۔ جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوئے۔ اس کی دکان بہت چمک  
 اٹھی۔ اب اس نے ہاتھ بٹانے کیلئے دو تین ملازم بھی رکھ لئے۔ ریڈیو  
 بھی لگا دیا۔ اخباروں میں اشتہار بھی دینے لگا۔ چند نمونے ملاحظہ ہو۔  
 زگل کا سینزن آگیا ہے  
 ہماری دکان پر تشریف لا کر زگل بھی ہاروں کے آپ ٹوڈیٹ  
 ڈیزائن ملاحظہ فرمائیے۔

---

گریٹ گارو کی نئی پچر کی تقریب پر گل گارو کے  
 گھرے پنہنے اور پنہائیے۔

---

پھولوں کے خوشنما آدیزے آپ کے حسن کے بہترین  
 ممانظ ہیں !

---

پر دے کا نام انتظام ہے۔

---

گل فروش کی مساعی جمید کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا، بار

گجرے دغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائٹی میں از سر نو زندہ ہو گیا۔ پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ، دفتر بھی پھول لے لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیارہ سے گندی میزیں اور قلمدان پھولوں سے سج گئے۔ دفتر گلستان بن گئے۔ ہر طرف اک جھک سی اڑی پھرتی تھی۔ کابج کے طلبہ تو ہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ثانی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے چننے لگے

حور توں اور پھولوں کا میل تو یوں بھی آسکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب تو انتہا ہی ہو گئی۔ اگر ایک خاتون سراپا "زگس" بنی ہوئی جا رہی ہے تو دوسری "موتیا" کی ڈالی، ایک زعفران زار تھی تو دوسری دھان کا کھیت، جس کی بھینی بھینی خوشبو اور خوشنما ہریا دل آنکھوں کو طراوت بخشی تھی۔

ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا لیکن ہندوستان کی انصاف قدیم روایات کو تازہ کرنیوالے کا دل ہمیشہ غمگین و محزون ہی رہا۔ نوجوان گل فروش ہمیشہ یہی سوچا کرتا کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا تو اس وقت تک کم از کم بی اسے پاس کر لیتا۔ اور پھر اس کو "ٹوکری" کہیں بل ہی جاتی۔ اور پھر اس کی مشادی

بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی۔ اور یہ بالکل اغلب تھا۔  
 لیکن ..... اب ..... اب وہ بے سانس بھرتے ہوئے سوچتا  
 اب اس کی زندگی اس پھولوں کی دکان پر ریڈیو سن کر اور گھرے بیچ  
 کر برباد ہو گئی تھی۔ اب وہ محض ایک دیران، شکستہ، کھنڈراتی زندگی  
 کا مالک رہ گیا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے محکمہ کی طرح، تعلیم یافتہ لڑکی تو اس  
 کے طبقے میں دو ہزار بیویوں والا بجلی کا قلم لے کر ڈھونڈنے پر بھیج  
 دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں  
 پڑھاتے تھے غالباً ان کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی کسی پھول  
 بیچنے والے کے چلے باندھ دی جائے۔ وہ سماج کا اچھوت تھا۔ ہر عین  
 ہری جن ..... اب ان اوپنٹے طبقے والے لوگوں نے ایک نیا  
 لفظ اسی پرانے خیال کو او اکر نے کیلئے اختراع کیا ہے۔ کچھ بھی ہو  
 وہ اپنی زندگی ایک آجڑ اور پھوٹڑیوی کیساتھ نہیں بسر کر سکتا تھا۔  
 جسے نہ تو باڈیس پہننے کا سلیقہ ہے نہ ساڑھی لگانے کا قرینہ اور  
 نہ ہی اخبار پڑھنے کی عادت، جو تمام دن اپنا سر چو لھے میں دے  
 رکھتی ہو۔ آؤنٹ ..... وہ کسی عورت سے شادی کرنے کا  
 خواہش مند تھا۔ ایک باورچن سے نہیں؛ لیکن اس کے باوجود  
 وہ دیگر امور میں ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی

بوڑھی ماں کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ اور گویہ بہت حیرت کی بات ہے پھر بھی یہ کچھ بغیر نہیں رہا جتنا کہ اُسے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ اور گو وہ ریشم کی خوبصورت قمیضیں پہنتا تھا جن پر لمبی لمبی خوش رنگ وحاریاں ہوتیں۔ اور عطر چلیل لگاتا تھا۔ پھر بھی اُسے شراب، سگریٹ اور زبڈیوں سے بہت نفرت تھی۔ سینما، ٹیلیوٹر دیکھنے پر بھی اس کے چال چلن میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ اس کے دوست اکثر اس پر تعجب کا اظہار کیا کرتے۔ آخر ایک پھول بیچنے والا کیونکر شریعت رہ سکتا ہے ؟

اس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا۔ یوں تو وہ اس پر جان پھڑکتی تھی، مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا "انسٹرنس" پاس بیٹا۔ آوارہ نہ ہو جائے۔ جو نوجوان پھول بیچتا ہو اور سینما دیکھتا ہو اُس کیلئے شریعت رہنا بہت مشکل ہے، آخر کب تک ؟

اسی لئے بوڑھی ماں اس کی شادی پر مُصر تھی، مگر نوجوان گلفروزش نہیں مانتا تھا۔ اس کے ناخبرہ کار شاعرانہ دل نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حُنین مودت بنا رکھی تھی۔ وہ اسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔

بس یہی جھگڑا تھا، ماں ایک میٹھی نرم مزاج، دیہاتی

بہو کے حق میں تھیں۔ اور ان کی نگاہ اپنے ہی قبیلے میں ایک قبولِ مودت  
غریب طبیعت لڑکی پر تھی۔ گل فروش اس کے برعکس ایک ساڑھی نواز  
سینا پسند، قہقری کی تلاش میں تھا..... مگر آہ، یہ وہ قہقریاں  
تھیں جو اس کے گلوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں۔ کیا وہ سوسائٹی کا  
اچھوت نہ تھا..... محض ایک گل فروش۔



ایک منہ خوار کی دلکش شام کا ذکر ہے۔ اس دن نشاط  
تھیٹر میں دلکھڑ بیوقوفوں کا لافانی شہ کار ”لے مسز الزبتھ“ دکھایا  
جانا تھا۔ اور گل فروش دکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی  
تیاریاں کر رہا تھا کہ اسنے میں ایک چھوٹی سی ”مارس“ گل فروش  
کی دکان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس میں ایک جوان لڑکی  
اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں۔ گل فروش دکان کی میز پر  
اتر کر موٹر کے قریب گیا۔ اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے  
کہنے لگا۔ ”میم صاحبہ کیا حکم ہے؟“ اس پر جوان لڑکی نے  
موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہیں کچھ ہار اور گجرے  
چاہئیں۔“



”آئیے، دکان کے اندر تشریف لائیے۔“

لڑکی نے بہت سے بار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلاسے، چٹنے دقت کہنے لگی، ”کل ہمارے ہاں ایک ڈانس ہے بال روم کو سجانا ہو گا۔ کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ۔ کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کر دو، ٹھیک ہے؟“

گل فروش نے جواب میں سر جھکا دیا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گل فروش نے چہرہ جھک کر سلام کیا اور انگلی زنی میں نوجوان لڑکی سے پوچھا۔

”سرکار آپ کا پتہ؟“

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا۔ ”۱۰، قلیش روڈ، پلیئرز!“

نوجوان گل فروش نے جلتی ہوئی موٹر کو جھک کر ایک فرضی سلام کیا اور آہستہ سے کہا۔ ”۱۰۔ قلیش روڈ، پلیئرز،“

۱

اس واقعے کے تین چار روز بعد گل فروش کی بوڑھی ماں

کو عکس ہوا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اکاس ہے۔ وہ نہ صرف کھانا کم کھانے لگا تھا بلکہ اب وہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے منٹوں ایک طرف ہلکی بانہ کر دیکھنے لگتا تھا۔ ایک نوالہ منہ میں، دوسرا ہاتھ میں لئے وہ کچھ سوچنے لگتا۔ پھر کچھ یاد آ جانے پر ایک آہ سرد بھر کر جلد جلد نوالے اٹھانے شروع کر دیتا۔ کبھی دو چپاکی چاننی جیسی حسین اور نازک کلیوں کو زری تاروں میں پروتے ہوئے یکا یک گرک جاتا، مسکراتا، پھر فوراً غمگین ہو جاتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ اور جب اس کی ماں اس سے دریافت کرتی، کیا بات ہے بیٹا؟ تو وہ اس در و بھرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیتا اور کہتا: ”کچھ بھی نہیں اماں!“

اے اماں دل میں سوچتیں، ضرور کسی لڑکی نے اس کے دل کو مہ لیا ہے، یا اللہ وہ کون ہوگی؟ — میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟“

خود بے چارے گل فروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اس کیساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہر روز حسین عورتیں دیکھتا تھا۔ اس نے تو سینکڑوں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے۔ نازک اندام کلائیوں میں گجرے پہننے کے نئے نئے انداز سکھائے تھے کتنی

شوخی لگا ہوں کے وار ہے تھے۔ ہزاروں تبسم لبوں سے شہید  
 کی طرح میٹھی بولیاں سنی تھیں۔ کسی کے گداز بازوؤں کے سٹو لپن  
 نے اُسے اتنا متاثر نہ کیا تھا۔ اور قوس قزحی ساڑھیوں کے خوشنما  
 رنگ اس کے معصوم دل پر ہمیشہ سائے کی طرح گزر جاتے تھے۔  
 لیکن اب ایک لعنت یہ کیا ہو گیا تھا..... جب بال روم کو سجاتے  
 وقت وہ بھی اس کے پاس آکر ایک دم کیلئے کھڑی ہو گئی تھی۔ تو  
 اس کی آنکھیں کیوں جھپک گئی تھیں۔ سانس کیوں ایک لمحے کیلئے  
 رک گئی تھی۔ اور جب وسطی فانوس کو لمبے لمبے باروں سے مزین  
 کرتے وقت اس کی انگلیاں اس کے ہاتھوں سے چھو گئی تھیں۔ تو  
 اس کی رگوں کا خون کیوں آتش سیال بن گیا تھا۔ اور پھر..... جب  
 اُسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ ایک دم پانیو کی طرف  
 چلی گئی تھی۔ تو وہ کیوں بیتاب ہو گیا تھا۔ اور یہ کس قدر عجیب  
 احساس تھا کہ اسے پانیو بجاتے سن کر اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے  
 گویا اس کے دل کی تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں۔ اور اُنہی  
 میں سے ایک رنگین و حزیں نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساسِ محبت تھا۔ وہ احساس جو عمر میں صرف  
 ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے گلہ فروش کی آنکھوں میں آنسو

بھرائے تھے۔ اور اس نے جلد ہی سے ایک کونے میں جا کر اپنے  
آنسو پونچھ ڈالے تھے



اس امر کا صحیح اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے کہ لڑکی کے  
دل پر گلفروش کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا اثرات پیدا  
کئے۔

مگر یہ کہنے میں تو ذرا تامل نہیں کہ اب وہ اکثر اس کی دکان  
پر آیا کرتی تھی۔ یہی پھولوں کے آویزے خریدنے کیلئے، گلہستے  
گجرے پسند کرنے کیلئے۔ لیکن یہ تو ایک اتنی معمولی سی بات تھی۔  
جسے کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی تھی۔ کالجوں کی کتنی ہی لڑکیاں  
روزانہ گلفروش کی دکان پر آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب کیسے  
لیا جاسکتا ہے کہ وہ سب گلفروش سے محبت کرتی تھیں پھولوں  
سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے اُجڑے مالی  
سے محبت کی پینگیں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسی حماقت کون کریگا ؟  
..... اور صنعتِ نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں  
کے مقابلے میں زیادہ دانش مندی کا ثبوت دیتی ہے کون کہتا

ہے کہ گھنڈوں میں کبھی عقل مند نہ تھا، مگر اب تو نہ جانے اس کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا تھا، کہ جب وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے دکان میں داخل ہوتی اس کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگتا، وہ سمجھتا کہ وہ خفیف سی سکراہٹ جو اس کے رنگیں لبوں پر کبھی کبھی آجاتی تھی، صرف اسی کیلئے تھی۔ اس کی مندی کلائیوں میں پڑی ہوئی تقری چوڑیوں کی میٹھی چھنچھناہٹ اسی کے کانوں کے لئے پیدا ہوئی تھی، اور سفید ساڑھی میں چھپے ہوئے کانوں میں گلاب کے پھولوں کے جھللاتے ہوئے سرخ سرخ آویزے شاید اسی کی حوصلے نگاہوں کیلئے پہننے جلتے تھے شاید؟ .....

وہ کبھی کبھی خیال کر لیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے کبھی کسی اندھیری رات میں جب کوئی اسے دیکھ نہ سکے، اس کی کوشش کے گرد چکر لگاتا اور مغربی سمت کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر خوش ہوتا۔ اور پھر جب کبھی ایک چھپرہ یا سایہ اس روشنی کے ایک طرف سے ہو کر دوسری طرف کو گزر جاتا تو اس کے دل کی حرکت یک بارگی تیز ہو جاتی۔ اور کیا ایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ پھر وہ دیر تک کھڑکی کی طرف ٹھٹھکی لگاتے دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ روشنی بجھ جاتی۔ اور اس کے دل میں ایک اندھیرا سا چاہتا اور وہ

اس گہرائے ہوئے مسافر کی طرح جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔  
 اور اماں بیچاری دل میں روز کڑھتیں، ہٹے اللہ میرے بیٹے  
 کو کیا ہو گیا ہے؟ رات دن کس ٹکڑ میں غلطان رہتا ہے، کہیں کسی کی نظر  
 تو نہیں لگ گئی، کوئی آسیب؟ ..... پھر یکایک اپنے منہ پر  
 ہاتھ رکھ لیتی اور سر جھکا کر پاؤں کاٹنے لگتی۔  
 اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔

ایک ابراہیم کو دہی موٹر جو آئی تو گل فروش نے دیکھا۔  
 کہ بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی تھی، گل فروش کے جھک کر سلام کرنے پر بوڑھی  
 عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کل دن کو بہت سے پھول اور ہار وغیرہ دے کار ہوں گے اور  
 رات کو بھی کوٹھی سچ جا۔۔۔۔۔“  
 ”بہت اچھا سرکار“ گل فروش نے یہ کہہ کر ایک تیز نگاہ موٹر  
 کی خالی سیٹ پر ڈالی۔

بوڑھی عورت نے پھر مسکرا کر کہا، ”کل مسمیٰ ہر مزہ کی  
 شادی ہے، نا، بہت سے پھول چاہئیں۔“

موزیل دی غریب گلغزوش سر جکائے رہ گیا۔



دوسرے دن گلغزوش کو ایسا معلوم ہوا کہ اسے جکسا سا بخار ہے اس کا سر گھوم رہا تھا۔ مگر اسے آج تو بہت کام کرنا تھا۔ وہ بہت سویرے اُٹھا اور دکان پر کام کرنے چلا گیا۔ آج وہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کی محبوبہ کی شادی تھی۔ آج اس نے وہ وہ خوبصورت ہار اور گجرے تیار کئے۔ جو اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ آج کی محبوبہ کی شادی تھی۔ اس نے پھولوں کو ندیں تاروں میں الجھا کر نازک پلاریں بنائیں۔ حسین گلہستے کلیوں کے چندن ہار تیار کئے۔ اور موتیا کے نیم واسچلوں سے ایک خوب صورت ٹکٹ تیار کیا۔ آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی۔

گلغزوش نے کوشی کا کوڑو کوڑھلوں سے سجا دیا۔ وہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر جاگا پھر رہا تھا۔ اپنے ملازموں کو ہدایات دیتا جاتا تھا۔ کتنی گہا گہی، کتنی رونق تھی۔ ہڈھی عورت مسکراتی ہوتی ادھر سے اُدھر نکل جاتی۔ اور ایک سفید داڑھی والا گوری رنگت کا آدمی ہسیوں والی آرام کرسی میں بیٹھا ہو کر کسی کا ہنڈل گھما کر ادھر ادھر ڈھکیں ہوالے جا رہا تھا۔ ایک کمرے میں

اس نے اپنی محبوبہ کو بھی دیکھا تھا۔ وہ اپنے قبول سورت بھائی کے پاس بیٹھی — جھکی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ اور پھر وہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے۔ بعد ازاں دیکھ کر وہ گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی ایک لمحہ — صرف ایک لمحہ کیلئے گل فروش نے اسے علامت بار لنگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

کیا لڑکی کے نازک رنگین لب زنگیں بھی طرح زرد نہیں ہو گئے تھے اور کیا گل فروش نے واقعی اس کی نگاہ کی خطا واریاں دیکھ لی تھیں؟ شاید یہ اس کا موسم ہی تھا، کیونکہ دوسرے لمحہ ہی میں وہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہو گئی۔ آسمان پر تارے نکل آئے کوٹھی میں برقی قمقے روشن ہو گئے۔ آج دن بھر سے گل فروش بھوکا تھا، بھوکا؟ نہیں۔ اسے بھوک لگی ہی نہ تھی۔ اب اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھی ج چکی تھی۔ بیڈنچ رہا تھا۔ گل فروش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے چاروں طرف اندھیرا نظر آرہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ . . . . وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کیلئے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نیلے سے رومال میں مویا کے پھولوں کا بنا ہوا ٹکٹ لپیٹ رکھا تھا۔ لکاش وہ اپنے



ہاتھوں سے یہ ٹکٹ اُسے پہنا سکتا اور پھر اس کے قدموں میں گر جاتا۔  
 ..... بیوقوف گھنڈوش :-



رات کے نو بجے فلیش روڈ سے موٹر میں چلنا شروع ہوئیں  
 آگے آگے نوشہ کی کار تھی پھولوں سے سجی ہوئی۔ اس میں دو لہجہ  
 اور دھن بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے بیس تیس موٹر میں مارن بھاتی  
 ہوئی آرہی تھیں۔ فلیش روڈ سے ٹرنگٹن روڈ تک تو لوگوں کا بہت ہجوم  
 تھا۔ بندہ تھمتے اور مارنوں کی دلخراش آوازیں۔ موٹروں کے انجنوں کھے  
 گواگڑاہٹ اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا.....

خدا خدا کر کے جب ٹرنگٹن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا  
 شروع کیا۔ اور جب غاپ روڈ آگئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اڑی جا رہی  
 تھی۔ یہاں تک خوشگوار سا اندھیرا تھا، بجلی کے کھمبے بھی دور دور تھے  
 اور دوریہ گھٹن دار درخت کھڑے تھے۔

یہاں ایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا۔  
 اس کے ہاتھ کھلے تھے۔ اور وہ مین موٹر کی سمت دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔  
 نوشاہ نے زور سے مارن بجایا۔ اور موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا۔ اس نے

بریک بھی دبائی۔ مگر آہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔ وہ پگھل شمع کے موٹر کے نیچے آچکا تھا۔ اس کی چھاتی لہر بائیں بازو سے خون برساتا تھا۔ دھن ایک دلخراش پیچ مار کر بے ہوش ہو گئی۔



نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا کتے تھے۔ اسے اٹھا کر اسی دم ہسپتال میں لے گئے۔ زخمی کو فی الفور آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے۔ آہ یہ چارے کو بہت چوٹ آئی ہے۔ وہ کیوں موٹر کے نیچے آگیا۔ وہ کون ہے؟ کیا وہ بچ جائے گا؟ آخر ایک بے حرصے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا اور نوشاہ سے کہنے لگا۔ "آخری لمحوں پر ہے تمہاری مسز کو بلاتا ہے۔"

گلفروزش میز پر لیٹا ہوا تھا۔ چھاتی پر پٹی بندھی تھی۔ جو خون سے سرخ ہو چکی تھی، لڑکی کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر ایک جھکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے لڑکی کی جانب اپنا دامن اٹھ بڑھایا۔ آہ! اس ہاتھ کی لڑتی ہوئی انگلیوں نے کسی موتیا کے ٹکٹ کو تمام رکھنا تھا۔ ٹکٹ خون آلود تھا۔ پھول دلے

نے اپنے چہلوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی تھی۔ کس لئے؟ کب  
 اس ملاقات کے لئے؟ — بیوقوف گل فروش !  
 لڑکی نے ایک قلیل وقفہ کیلئے گل فروش کی طرف دیکھا۔  
 گل فروش کا سر اس کی چھاتی پر جک گیا اور لڑکی نے دونوں ہاتھ بڑھا  
 کر نمکٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ جیسے کوئی کسی مصمم قسیم پئے  
 کو اپنی گود میں لے لے۔ گل فروش کا بازو آہستہ سے میز پر گر گیا۔ اس  
 نے اپنی روح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی آنکھیں  
 بند کر لیں۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے پتے پتے ہونٹوں پر ایک  
 ہلکا سا مجسم نمودار ہوا۔ یہ چراغِ سحر کی جھللاتی ہوئی لوح تھی۔  
 گل فروش کا اکھڑا ہوا سانس مدبم ہو گیا۔ ڈاکٹرِ نبض پر  
 ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ گل فروش کے لب کا نہجے، ہلکی ہلکی ایک دو  
 ہچکیاں آئیں

چراغ بج گیا !

لڑکی رونے لگی۔

• یہ کون تھا؟ • ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا۔ . . . . نوشاہِ روتی  
 ہوئی دلعن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا۔

فلکڑ نے اپنے شانوں کو ایک خیف سی حرکت دی۔ اور  
نرس سے بولا۔ " دوسرا مریض لاؤ۔ "

دنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے۔ جب  
ایک مریض مر جاتا ہے تو دوسرا مریض اس کی جگہ لڑا آ جاتا ہے۔



اس حادثے کے چند دنوں بعد گل فروش کا چھوٹا بھائی اپنی  
دکان پر (اتار کلی کے سر کے قریب، تو تلی زبان میں گجرے اور چول  
بیچ رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے  
اسے نہایت دل آویز لہجے میں مجھ کر رہی تھی کہ وہ اسے ننھے  
گل فروش کی دکان سے چنبیلی کے پھولوں کے دو ننھے آویزے  
خرید دے۔



# دو فرلانگ لمبی سڑک

پکھریوں سے لے کر لاکھ کالج تک بس یہی کوئی دو فلائنگ  
 لمبی سڑک ہوگی۔ ہر روز جے اسی سڑک پرے گزرتا ہوتا ہے۔ کبھی  
 پیدل، کبھی سائیکل پر سڑک کے دور دورے سیرم لے سوتے سوتے  
 اور اس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ جن نے نہ چھاؤں، سخت  
 کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی  
 اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں۔ نہ اس  
 میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے۔ نہ ٹھکان، سخت سخت چٹھروں کو  
 کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے۔ اور اب اس پر کولار  
 بھی بچھی ہے۔ جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان  
 کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی  
 چوڑی سڑکیں، تہرادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر  
 سرخ، بھری بھی ہوئی تھی۔ سڑکیں جن کے گرد سرو، شمشاد کے ٹھٹھ  
 کھڑے تھے، سڑکیں ————— مگر نام لگانے سے  
 کیا فائدہ۔ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی ابھی  
 طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی  
 اتنی ابھی طرح نہیں جانتا۔

متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، ادھر صبح اپنے  
 گھر سے جو کچھریوں کے قریب ہی ہے اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاد کالج  
 کے پاس ہی ہے۔ بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور شام  
 کچھریوں سے ٹیکر لاد کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر  
 کبھی پیدل۔

اس کارنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی حیثیت میں تبدیلی  
 نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے جیسے کہہ  
 رہی ہو مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ اسے کسی  
 کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں، ہزاروں انسان گھوڑے، گاڑیاں  
 موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور جیسے کوئی نشان باقی

نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سائولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ  
ہے جیسی پہلے روز تھی۔ جب ایک یوریشین ٹیکیدار نے اسے  
بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے  
ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا واقعات، حادثے دیکھے۔  
ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے  
نہیں دیکھا۔ نہ روتے ہی۔ اس کی پتھر ٹی چھاتی میں کبھی ایک درز  
بھی پیدا نہیں ہوئی۔

”اے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پر ترس کر جاؤ گے  
بابا۔ اے بابو، خدا کیلئے ایک پیسہ دیتے جاؤ گے بابا، ارے  
کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب ہی میرے نئے نئے پچے بک  
رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان تیمیوں پر۔“  
بمیسوں گدا اگر اسی شرک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔

کوئی اندھا ہے تو کوئی لنگا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے  
تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے  
حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔  
کوئی پیسہ دے دیتا ہے، کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی



گالیاں دے رہا ہے، حرام زادے، مستندے کام نہیں کرتے بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بھیک

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکاری کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تان رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پیروں تلے آگیا ہے۔ اس کی پسلی کی ٹہیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کو افسردگی بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

بوڑھا آدمی اب گدلیوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑھی کا لہر قتی حاشیہ بوڑھے کی حریف آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے۔ گدہ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی، اوٹانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا نام ہے تیرا، کر دوں چالان ؟ ہجور، ہجور کا بچہ! پل تھلے، ہجور؟ یہ تھوڑا ہے، اچھا جاتھے معاف کیا۔

ٹانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑاتے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک گورہ آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی چھڑی رضاؤں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

”کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ۔“

”آٹھ آنے صاب۔“

”دل، چھ آنے۔“

”نہیں صاب۔“

”کیا بچنا ہے، ٹم۔۔۔۔۔“

ٹانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر ٹانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرام زادے، صاحب

بہادر سے معافی مانگو، مانگے والا اپنی میلی پکڑی کے گوشے سے آنسو  
پونچھ رہا ہے۔ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب شرک پھر سنان ہے۔

شام کے دھندلکے مین بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ میں  
نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس  
پہنے باقیں کر رہے ہیں۔

”بھیا بھرتی ہو گیا؟“

”ہاں۔“

”تخووا تو اچھی ملتی ہوگی؟“

”ہاں۔“

”بڑھنوں کے لئے کھالائے گا۔ پہلے بیوی تو ایک ہی

پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔“

”سنا ہے جنگ شروع ہونے والی ہے۔“

”کب شروع ہوگی؟“

”کب اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے

جائیں گے۔“

”کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر؟“



” اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تو تو باولی ہوئی ہے۔“  
 ” اچھا بیٹی، اچھا بیٹی۔“

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے۔ اُپلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا۔ کوئی اُسے ایک لمحہ سستے نہیں دیتا۔ وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔ اُس کی جھریوں میں غم ہے۔ اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی !

تین چار نوخیز لڑکیاں، بیٹرکلی ساڑھیاں پہنے باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں۔  
 بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں۔  
 بہن، آج لارنس گارڈن چلیں۔  
 بہن، آج انارکلی،  
 ریگیل ؟

## شٹ اپ یو فو!

آج سڑک پر سرخ طوان بچا ہے، آریار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ بابا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ گھسی بڑے آدمی کی آمد ہے۔ بھی تو سکولوں کے چوٹے چوٹے بڑے کے ٹیلی پگڑیاں باز سے سڑک پر دو دو یہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چوٹی چوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر میڑیاں جم گئی ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی مدت سے تپتا آئے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔

جب وہ پیلے پیلے بیاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے۔ تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چپ ہیں۔ چوہ بڑے کے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ استاد اب انہیں کان سے پکڑ کر آٹھارہے ہیں۔ شفیق کی پگڑی کھل گئی تھی۔ استاد اُسے تھوڑا کبھ رہا ہے۔ اور شفیق پگڑی ٹھیک کو، پیارے لال کی شلوار اس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور

اذا رہند جویوں تک لٹک رہا ہے ۔ دتھیں کتنی بد سہا ہے پارے  
لال ۔ !

” ماسٹر جی پانی ؟ “

” پانی کہاں سے لاؤں یہ میں تم نے اپنا گھر سمجھا رکھا ہے :  
دو تین منٹ اور انتظار کرو ، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے ۔ “

” دو تین منٹ ، تین منٹ ، آدھ گھنٹہ ۔ “

” ماسٹر جی ، پانی ،

ماسٹر جی ، پانی ،

ماسٹر جی بڑی پکس لگی ہے ۔ “

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے ۔ وہ  
باہر آدھر دوڑتے پھر رہے ہیں ۔ لڑکھو ہوشیار ہو جاؤ ۔ دیکھو جھنڈیا  
اس طرح بلانا ۔ ابے تیری جھنڈی کہاں ہے ؟ قطار سے باہر  
ہو جا ، بدماش کہیں کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساری آرہی ہے ۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ ، بینڈ کا شور ، پتلی اور چوٹی

جھنڈیاں بے دل سے ملتی ہوئی ۔ سوکھے ہوئے گلوں سے  
پڑمرہ نعرے ۔

بڑا آدمی شرک سے گزر گیا ، لڑکوں کی جان میں جان

آگتی ہے۔ اب وہ اچل اچل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوابچے والوں کی صدائیں۔ ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوہ پوری، نان کباب۔

ایک خوابچے والا ایک طرے والے بابوے جھکڑ رہا ہے مگر اپنے میرا خواہجہ الٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا۔ میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان بھرا کر دیجئے تو میں جانے دوں گا۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بنگلی شکر پر جھاڑو دے رہا ہے اس کے منہ اندنک پر کپڑا بندھا ہے جیسے بلیوں کے منہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں۔

میں سپاٹی کا پانی والا چھڑا آہستہ آہستہ شکر پر چھڑکاؤ کر رہا ہے چھڑے کے آگے جھٹے ہوئے دو بلیوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھڑے والا سردی سے غصہ کرتا ہوا کوئی



گیت گمانے کی گولشش کر رہا ہے۔ بلیوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں  
کہ ابھی سڑک کا کتا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا لگا اگر مارا پڑا ہے اس  
کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی  
کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کیلئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا۔  
کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سناں  
ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے۔ سنتی ہے۔ بگڑش سے مس نہیں  
ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم جس اور وحشی ہے۔  
انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر  
اسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو، ایک بلند  
دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر  
آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی اور اس کا  
کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا  
ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ٹپ پھنسنے  
لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے  
 مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں مان سڑکوں کی آزادی نہیں  
 چاہتا۔

سڑک خاموش ہے اور انسان، بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے  
 اونگھ رہے ہیں۔  
 یہ دو فرلانگ لمبی سڑک !



## بند والی

وہ دھان کوٹنے والی تھی۔ اور بند کے آس پاس رہتی تھی۔ میں اسی ہٹس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس واقعہ کو کم و بیش تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اور بڑے بھائی جان اور بھابی جان پہلی دفعہ سرنگڑ آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے بھابی جان کے خون کا دباؤ خطرناک طور پر زیادہ بتایا تھا۔ اور گرمیوں میں کشمیر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمیں یہاں آئے تقویٰ با ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مگر اب تک میں اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ ہر روز اسے چھت پر سے دیکھتا تھا۔ اور ہر روز دھان کوٹنے میں مصروف پاتا۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود ہماری آنکھیں چار ہو جایا کرتی تھیں۔ کشمیری حسن یوں بھی تو بہت مشہور ہے مگر اس

لڑکی میں ایسی عجیب دل کشی، بانگپن اور دل آویزی تھی کہ کچھ بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یوں تو اس کے ہاتھ اور ٹخنے عموماً میلے ہوتے تھے اور لباس بھی بوسیدہ اور جا بجا سے تار تار۔ لیکن اس کے بے دایع حسن کے فراوانی نے انکس کی کم مائیگی اور بے چارگی کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے حسن میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ میرا دل بے انتہا اس کی طرف کھینچا جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں ہی اُسے ہر وقت دیکھتا تھا۔ وہ بھی کسی وقت جب میں کوئی ناول پڑھنے میں مشغول ہوتا یا غروبِ آفتاب کے وقت دریا میں تیرتے ہوئے شکاروں کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ میری طرف دُوریدہ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتی۔ اور پھر جب یکایک ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے ملتیں۔ تو وہ کسی قدر شرماتی۔ اٹھا ہوا مسل آہستہ سے اڑھلی میں گر جاتا۔ اور لابی لابی پلکیں شرمگین رخساروں کو چوم جاتیں۔ ہر روز اسی طرح نظارہ بازی ہوتی تھیں۔ میں خوش تھا اور دل میں سمجھتا تھا کہ اس راز سے اور کوئی آگاہ نہیں۔ اس لئے ایک روز مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میرے نوکر چمن نے مجھے آکر سنا کر جانی جان پوچھتی تھیں کہ یہ سامنے بند والی لڑکی ہر وقت اور کب کیوں دیکھتی رہتی ہے۔ اور یہ کہہ کر کم نجت مسکرانے لگا۔ معلوم نہیں کتنا تھا یا جھوٹ۔ مگر مجھے جانی

جان سے پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

ایک شام کا ذکر ہے میں سیر سے واپس آرہا تھا کہ بند کے اس طرف جہاں خیال لال اور شاہ طوط کے بڑے بڑے گھنے اور قد آور درخت کھڑے ہیں وہ مجھے یکایک مل گئی۔ اور مجھے دیکھنے ہی ٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ خوب بنی ٹھنی تھی۔ ایک تنگ نیلے رنگ کا پر ہنص پہنے تھی۔ جو اس کے تناسب اعتدال کو اچھی طرح نمایاں کر رہا تھا۔ ٹھنے تو نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن ہاتھ آج غیر معمولی طور پر صاف تھے اور بے دارع۔ دودھ جیسی سپید گردن میں لڑیوں میں پروٹے ہوئے سرخ منکے نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ سرخ و سپید زخار چمک رہے تھے۔ اور ان آنکھوں کی نیلی گہرائیوں کو کیا کہوں خضیں دیکھ کر ڈال میں کھلے ہوئے کنول کے پھول یاد آجاتے ہیں۔

میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کرا

کو پوچھا۔ کدھر جا رہی ہو؟

اس نے شرما کر ہاتھ چھڑانے کی ایک ناکام سی کوشش کی اس کے پتے پتے لب کا پنے جس طرح بول کی پتیاں ہوا میں کاٹی ہیں۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا چار کے درختوں کی طرف لے چلا۔ وہ نا۔ نا۔ نا کرتے

بارہی قس اور مجھ سے لپٹی جا رہی تھی ۔

ایک بڑے چنار کے نیچے ہم جا کر بیٹھ گئے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو چوم کر کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے اسے بند والی دکھائی دے رہی ہے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔ بینک میں جھوٹ بول رہا تھا۔ صحن میں تو اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ یوں بھی تو محبت میں صداقت خدا نے عورتوں ہی کو ودیعت کی ہے۔

اس نے سحر طراز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور باریک سی آواز میں کچھ کہا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کشمیری زبان میں بول رہی تھی۔ بہر حال اس کا لب و لہجہ نہایت دلکش تھا۔

• ادھر دیکھو • میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا مجھے تم سے محبت ہے • میں رک رک کر اسے عاشقوں کی زبان میں سمجھا رہا تھا • • • • • میرا • • • • • نام • • • • • میں نے ہاتھ کے اشاروں سے بتلاتے ہوئے کہا۔ میرا نام فیروز ہے سمجھتی ہو نا؟ میرا نام فیروز ہے اور • • • • • تمہارا • • • • • نام • • • • • کیا ہے ؟

معلوم نہیں اس نے کیا سمجھا۔ وہ جلد جلد اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ وہ نہایت روانی سے اور غالباً نہایت فصاحت سے

بول رہی تھی۔

الفت، بیچی، شوہر یہی تین نغمہ سیری سمجھ میں آئے۔ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن

اس نے جھٹ منہ پھیر لیا اور ————— اور بھی زور سے رونے لگی۔ وہ ایک محسوس نپے کی طرح رونے پر گویا تلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی اسے بچوں کی طرح گدانا شروع کیا۔ اور اتنا گدایا کہ وہ روتی ہوئی سکرا پڑی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

اب کہو: میں نے اسے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا پھر روؤ گی؟ جیسے وہ میری بات سمجھ گئی۔ اس نے انکار میں سر ہلادیا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کہیں تارے جھلک رہے تھے۔ اور چنار کی پھلی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان بہارا مرز نو بھی کسی دوشیزہ کے ٹوٹے ہوئے گلگن کی طرح ہلک کر رہ گیا تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آرہے تھے اور ان کے دوشیں پر شکار سے چلاتے ہوئے مانیوں کی پرگٹیاں صدائیں لڑ رہی تھیں۔



میں نے کشمیری دوشیزہ کی طرف حویسانہ نگاہوں سے دیکھ  
اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دیں کہ اسے اپنی آغوش میں لے لو  
اس نے آہستہ مگر مستحکم ارادے سے اپنے آپ کو میری گرفت سے  
چھڑایا۔ اور سرزنش کے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے لگی۔

صرف دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔ گناہ۔ گناہ۔ گناہ۔ ....  
میری جان! میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے  
کہا۔ اگر یہ گناہ ہے تو ہوا کرے۔ یہ گناہ مجت ہے۔

اس نے تڑپ کر ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑایا  
اور میری طرف شعلہ بارنگاہوں سے دیکھ کر کچھ کہنے لگی۔ غالباً ملامت  
کر رہی تھی۔ میں سر جھکائے سن رہا تھا۔ بلیں و مجبور ہو کر سر جھکانے  
سن رہا تھا۔

شاید اسے مجھ پر کچھ حسم آگیا۔ اس نے میری طرف  
عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔  
اور میرے کان میں کچھ پیار سے پیار سے الفاظ کہہ کر بھاگ گئی۔  
چنار اور بلوط کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی یہ با وہ جا، ایک  
دم غائب ہو گئی۔

میں کچھ دیر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اٹھا۔

اپنی چھڑی اٹھائی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔  
یار تم فرے گدھے ہو۔ گدھے اور امحق اور آلو !



دوسرے دن دوپہر کو میں چھت پر چڑھا۔ اور چاروں طرف  
نظر دوڑائی۔ لیکن جانِ آرزو کہیں نظر نہ آئی۔ اوکھلی منہ کھولے پڑی  
تھی۔ اور ساتھ ہی موصل بھی میڑھا پڑا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ نہ  
دھان کی بوہری کہیں نظر آتی تھی۔ نہ دھان کوٹنے والی۔ میں حیران  
تھا اور دھکا کس کا ایک ناول گھنٹوں پر رکھے یوں ہی سوچ رہا تھا۔  
آج دھوپ کتنی فرحت بخش ہے۔ وہ آج کدھر چلی گئی ہے۔ کہیں  
بیہارہ پڑ گئی ہو۔ دیا کا پانی آج کس طرح نیلم کی طرح چمک رہا ہے  
وہ نیلا پیر بن اسے کتنا بجلا معلوم دیتا تھا۔ اور وہ گلے میں سرخ منکے  
مگرے بہت شوخ و شنگ۔ میں اسے جتنی بھولی بھجتا تھا۔ وہ اتنی  
ہی طرار نکلی۔

رحمن میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے ابرو  
استقبالیہ انداز میں اوپر اٹھائے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ آج فریزی  
کو خوب مار پڑی۔ فریزی ؟ فریزی ؟ کون۔ فریزی ؟  
رحمن نے ہند کی طرف اشارہ کیا۔ وہی دھان کوٹنے

والی فریزی .... فریزی . میں نے آہستہ سے دل میں دہراستے ہوئے کہا . خوبصورت نام ہے فریزی .... فیروز .... فریزی . ولکاکس سے تو بد رہا اچھا ہے . اونہہ ! ولکاکس بھی جلا کوئی نام ہے ! اور رحمن آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا . اس کے باپ نے . اس کے بھائی نے . اور اس کے ہونے والے شوہر نے ! اسے خوب ہی پٹیا . کل شام کو پتہ نہیں وہ کہہ چکی تھی . اور بیت دیر کے بعد واپس آئی تھی . ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے . ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے اس کے منگیتر نے اس کے لئے ایک نیلا ریشمی چٹہ خریدا تھا کہ وہ اسے نکاح کے روز پہنے . کم بہت وہی نیلا چٹہ پہن کر کہیں چلی گئی . گویا کہیں اپنا بیاہ رہا ہے جا رہی تھی . ان عورتوں کا کیا اعتبار ہے . مگر آج بچی بھی خوب ہے عمر بھر یاد رکھے گی .

کیا بچو اس کو رہے ہو ؟ میں نے گرج کر کہا . دور ہو جاؤ بیباں سے . میں نے تم سے کب کہا ہے کہ فریزی اور اس کے منگیتر کے قصے یوں مجھے آکر سناؤ ؟ یہ کہہ کر میں نے کتاب کو زور سے کھولا اور اُسے نہایت توجہ سے پڑھنے میں مشغول ہو گیا . گو میں نے نگاہ اوپر نہ اٹھائی . لیکن بھڑکی جان گیا تھا کہ شیطان میری طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے . میں نے اس کی طرف مزید

توجہ دینی مناسب نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس کے واپس چلے جانے کی چاپ سٹائی دی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو سامنے فرنی کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں دھانوں سے بھرا ہوا تھیلا پکڑے تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے بار بار آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ ہاں وہ رو رہی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر اور بھی نور زور سے رونے لگی۔

میں نے پریشان ہو کر اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ یہ لڑکی تو مجھے مفت میں بڑا نام کرے گی۔ میں بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں کم نخت روئے جاتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ کتنی آجڑ ہے اور گنوار۔ کس طرح میری طرف ٹھٹھکی باندھے دیکھ رہی ہے اور روئے جاتی ہے۔ مجھے نیچے ہی چلنا چاہیے۔ میں اپنے دل میں اپنی غلطی پر پھتا رہا تھا۔ اور اس بیوقوف لڑکی کو کوس رہا تھا۔

میں نے کتاب اٹھائی۔ کرسی کو تھکایا اور اسے بازو میں ٹھکانے ہوئے فرنی کی طرف نگاہ کئے بغیر نیچے اتر گیا۔ غلی منزل میں زینے کے قریب بجائی جان کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ”نیچے اتر آئے ہو دھوپ تیز ہو گئی ہے؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”اور سر میں ہلکا سا درد بھی محسوس کرتا ہوں۔“ تمام دن بستر پر لیٹا رہا اور پھر جتنے دن سرنگرمی رہا۔

کبھی چست پر نہیں گیا۔ سات آٹھ روز اسی طرح رہنے کے بعد  
میں نے بھائی صاحب سے صاف کہہ دیا کہ میرا تو اب یہاں دل  
نہیں لگتا۔

”واپس شجاع آباد چلے جاؤ۔“

”بہت اچھا۔“ میں نے کہا اور دوسرے ہی دن سرسنگر  
سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

‡ ‡ ‡

اتنا کہہ کر فیروز خاموش ہو گیا اور ہوس بھڑک کے ڈرائنگ  
روم کے در پہلے سے باہر دیکھنے لگا۔

بس ! میں نے آہستہ سے پوچھا۔ مجھے غیر محسوس طریقہ  
پر یقین ہو گیا تھا کہ داستان کا دلچسپ حصہ ابھی باقی ہے۔ اس  
لئے کچھ توقف کے بعد میں نے پھر استفسار کیا۔ بس ؟

فیروز نے آہستہ سے ایک سگڑا سلگایا۔ ایک دو کھنٹے  
لگائے۔ اور دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے رک رک  
کر کہنے لگا۔

”نہیں..... تو..... اچھا..... بقیہ بھی سن لو۔“

گھر پہنچ کر بھی میرا دل نہ لگا۔ ہر وقت پریشانی سی رہتی تھی۔ اور دل میں ہر آن کچھ عجیب سی بے چینی اور بے کلی پاتا تھا۔ کچھ عجیب ہی حالت تھی کہ جس کا ہر بار تجزیہ کرنے پر بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کبھی سوچتا میں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ کبھی سوچتا، میں نے جو کچھ کیا موقع و محل کے مطابق وہ ٹھیک تھا اور اگر ایسا نہ کرتا تو شاید۔ اس گنوارن کے لئے اپنی اکبر و منی میں ملا لیتا۔ اور پھر کیا ایک اس گنوارن کا بھولا بھالا روتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا۔ دل میں ایک کسک سی ہوتی۔ اور میرے ہے اختیار اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتا۔ میں نے آخر کیا ہی کیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے میں نے ہرگز کوئی گناہ نہیں کیا۔ کم از کم اس معاملے میں تو میرا ضمیر صاف ہے۔ مگر پھر وہی روتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ اور ان نیلی آنکھوں سے بہتے ہوئے طوفان کے آگے میری سب طفل تسلیاں ریت کی دیوار کی طرح نہ جاتیں۔

ایسی طرح ڈیڑھ مہینہ اور گزر گیا۔ خزاں آئی اور خزاں کے آتے ہی بھائی صاحب اور بھابی جان بھی سر بیٹگر سے آگئے میں اسٹیشن پر اٹھیں لینے گیا تھا۔ بھابی جان اب بالکل اچھی ہو

گئی تھیں اور ان کے بشاش اور پر رنق چہرے کو دیکھ کر ایک لمحے کیلئے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ دوسرے لمحے ہی میں دجائے کیوں میں ادا اس ہو گیا۔ آدمی کی نفسیاتی زندگی میں پرواز خیال بھی عجیب چیز ہے۔ بھائی جان کو دیکھتے ہی فریزی یاد آگئی کتنی عجیب بات تھی۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ لپیٹ فارم پر کھڑے کھڑے میں صاف اللہ واضح طور پر فریزی کے طول چہرے اور اندو گھیس آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ یا شاید یہ سب واقعہ ہی تھا۔ بھائی صاحب نے میرا چہرہ یکایک اُترا ہوا دیکھ کر کہا۔ کس سوچ میں پڑے ہو؟  
 • کچھ نہیں • میں نے آہستہ سے کہا۔ ادھم موڑ میں بیٹھ کر گھر آگئے۔

شام کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سفر کی باتیں اور سرچنگر کی باتیں۔ سن مرگ اور پہلکام کے مناظر، کسٹم والوں کی بے ضابطگیاں۔ زعفران کے کھیت اور قنداریور کی بد مستیاں۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے بھائی صاحب آنکھیں جھپکنے لگے۔ سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ میں بھی اُٹھ کر خواب گاہ میں چلا آیا۔  
 خواب گاہ کے اندر رحمان بستر بھاڑ رہا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے رکا۔ پھر بستر بھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے آپ سے محبت ہو گئی تھی ۔  
 اس کی نگاہیں ہمیشہ ہنس بوٹ کی چھت پر کسی کو ڈھونڈا کرتیں ۔ اور  
 پھر وہ اسی طرح سمجھتے سمجھتے سہے اختیار ہو کر رونے لگتی ۔  
 میرے دل پر ایک تیر سا لگا ۔ آہ ! وہ مجھ سے محبت کرتی تھی  
 ..... ایک دو شیزہ کی پہلی والہانہ محبت ۔

اس کے ماں باپ نے اُسے بہت بھایا ۔ بھایا اور آخر  
 تنگ آ کر اس کی شادی کر دی ۔  
 ارے ۔ میں نے چونک کر کہا ۔

” شادی سے ایک روز پہلے وہ میرے پاس آئی ۔ ” رمن  
 نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ وہی نیلا ریشمی چھ  
 پہنے ہوئے تھی ۔ وہ نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا  
 تھا کہ وہ رو کر اس کی آنکھوں کے چشے سوکھ گئے ہیں ۔ اور چلا  
 چلا کر اس کے گلے میں آواز کی قوت باقی نہیں رہی ۔ ” وہ کدھر  
 گئے ہیں ؟ ” اس نے کھوکھلی سی آواز میں مجھ سے پوچھا ۔

” وہ گھر واپس چلے گئے ہیں ۔ ” میں نے جواب دیا ۔  
 اس پر وہ جینی نہ چلائی ۔ گردن جھکا کے چپ چاپ دیر تک  
 کھڑی رہی ۔ پھر آہستہ سے بولی ۔ ” وہ کب آئیں گے ؟ ”



مجھے اس پر حسم آ رہا تھا۔ ریشمی چند پہنے ہوئے بھی وہ کس قدر غریب معلوم ہو رہی تھی۔ غریب اور بے کس، گنتی بے چارگی اس کے لیے میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی اس چھٹی سی عمر میں مصائب و آلام کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ گردن جھکائے کھڑی تھی۔ اور میرے جواب کی منتظر تھی۔ اس کے پھول سے رخسار جو کبھی سیب کی طرح سرخ تھے۔ آج برف کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ بس موم کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ کاش میں اسے تسلی دے سکتا۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا کہ میں اُس کی آس بندھا سکتا۔ اور اس کے زرد زرد چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑا سکتا۔ یہ کہہ کر رحمن کچھ دیر چپ ہو رہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”دوسرے روز اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے تیسرے روز وہ اپنے کمرے میں مڑہ پائی گئی۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔“  
 فیروز خاموش ہو گیا۔ ہمارا شکا ماڈل میں داخل ہو چکا تھا۔ باغیوں کے چپوں کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ وہ نہایت نرم اور پرسوزے میں چپوں کی آواز کی ال پر گما رہے تھے۔  
 ”میرے پیارے آتیرے انج میں بہا آئی ہوئی ہے؟“

میرے پریم آ۔ آکر تیرے درخت پھلوں سے لمبے پڑے ہیں  
میرے پیارے آکر پھلوں کی بہار کا زمانہ میں نے کاہش انتظار  
میں گزار دیا۔

میرے پریم جلد آ، کہیں اس بہار کو خزاں کا دیو نہ چٹ  
کر جائے۔

”اور بس میری کہانی بھی یہاں ختم ہوتی ہے۔“ فیروز نے  
آہستہ سے کہا۔ اس کے لبوں پر ایک یاس انگیز مسکراہٹ کھیل  
رہی تھی۔ وہ کشتی کے پہلو پر جھک گیا۔ اور ہاتھ سے اشارہ کرتے  
ہوئے بولا۔ ”وہ وہ دیکھتے ہو نا۔ وہ جو ڈل کے اس طرف چلا  
کے درخت میں۔ وہاں اس کنج میں سرسبز گاس کے نیچے میری  
فری فری محراب ہے۔ غروب آفتاب کے بعد وہاں چلو گے  
ارشاد بجائی۔“

دور بہت دور ایک دہلی اپنی کشتی کو کنارے پر لگا رہا  
تھا۔ گمانے کی آواز نے شاید اسے بھی متاثر کر دیا تھا۔ فضا کی  
خاموشیوں کو چیرتی ہوئی۔ پانی کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی۔ اس  
کی سرلی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔  
”آہ میرے پریم! تیرے باغ میں بہار آئی اور چلی

بھی گئی ۔

آہ ۔ میرے پیارے ! تیرے درختوں پر پھول کھلے اور مرجھا بھی گئے ۔

آہ ۔ میرے پریم ! درختوں کے پتے تیرے انتظار میں تدد ہو گئے ۔ اور ان پر ہفت ایک سفید دیو کی طرح چھا رہی ہے ۔

آہ ۔ میرے پیارے ! تو نے اپنے خزانے کو یوں لٹا ہوا چھوڑ کر پدیں کیوں جا بسا ؟

میں نے اس کا ہاتھ ندر سے دبا دیا ۔ میری آنکھوں میں آنسو اُڑ آئے ۔ ہم دونوں پر وہ اشاکر باہر دیکھنے لگے ۔

ڈل کی نیلی نیلی لہروں پر آفتاب کی آخری کرنیں لڑاں تھیں ۔ سواہیں پھولوں کی بو بسی ہوئی تھی ۔ ہمارے ارد گرد کنول کے پھول تیرے تھے ۔ اور ان کی نازک نازک پتیوں پر پانی کے قطرے ٹپکے ہوئے تھے ۔ کسی کی ہلکیوں پر آنسوؤں کی طرح اور شفق کی ارغوانی روشنی میں چمک رہے تھے ۔ کسی کے گلے میں سرخ منکوں کی طرح ۔

ویکی نیٹر

جب میں الین۔ اے میں فیل ہو کر اس گاؤں میں ویکسی ٹر  
 بن کر آیا تو وہ چیز جس کی کشش نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف  
 متوجہ کیا ریشماں علی۔ ریشماں کے جن و جمال کا چرچا تو میں اس  
 سے پہلے بھی بہتوں سے سن چکا تھا۔ اور خاص کر راستے میں ایک  
 پولیس سارجنٹ نے جب اُسے معلوم ہوا کہ میں پنڈور کے گاؤں  
 میں ویکسی ٹر بن کر جا رہا ہوں مجھے بتایا کہ ”پنڈور کی دیکش وادی  
 میں یوں تو بہت سی چیزیں اور جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں بکشن جی  
 کاکنڈ جس کی گہرائی کا پتہ آج تک کوئی انگریز بھی نہیں لگا سکا۔  
 جاگیر دار صاحب کا پرانا محل جس کے چوکور برج دھوپ میں سونے  
 کی طرح چمکتے ہیں اور جو آج کل ویران پڑا ہے۔ اور صرف اُسے

وقت استعمال کیا جاتا ہے جب باگیر دار صاحب یا ان کے مہمان یا لڑکے بالے کبھی پنڈور کی وادی میں شکار کیلئے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ کھٹے ناموں کا جنگل، جو پنڈور کے مغربی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور جہاں جنگلی ٹنگ سیب آلوپے بھی اور ملوک کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگلی گلاب کی بیلے کسی محبوب کی باہر کی طرح ان پھلدار درختوں سے ہر وقت لپٹی رہتی ہیں۔ اور جن کی آغوش میں سے بنفشے کے پھول ہر لمحہ سکراتے اور شرماتے ہیں۔

ہاں پنڈور کی وادی میں بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں لیکن وہاں اگر تم نے ریشماں کو نہ دیکھا تو سمجھ لینا کہ تم نے پنڈور میں کچھ نہیں دیکھا۔

”سچ پرچ :- میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”خدا کی قسم“ —————! پولیس ساجنٹ نے

ایک لمبی آہ بھر کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

اگرچہ مجھے یقین تو اب بھی نہ ہوا۔ لیکن ریشماں کو دیکھنے کا شوق دل میں گھر کر گیا۔ آخر وہ بھی ایسی کیا حسین پری ہوگی؟ ان پولیس والوں کی باتوں پر اعتبار کم ہی کرنا چاہیے۔ اور پھر عورتوں کے متعلق تو ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ چاہے وہ مٹی

ہی کی کیوں نہ ہو۔

اب تو میری حالت اس بوڑھے مرنے کی سی ہے جو شباب گزر جانے پر بھی اپنے آپ کو جوان ہی سمجھتا ہے۔ لیکن ان دنوں جب میں نیا نیا وکسی فیئر مین کر رہا تھا تو میری شکل و شبہات بہت سے لوگوں کیلئے قابل رشک تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دنوں گاؤں بھر میں میں ہی اپنے ٹھٹھک کا ایک سبیلہ جوان تھا۔ اور پھر انڈینس پاس اور سفید لٹھے کی شلواریں پہننے والا، گیارہ روپے تنخواہ تھی۔ کلاہ پر طرے دار رنگی، پاؤں میں کام دار جوتی اور چہرے پر مچھلی سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی۔ ہاں وہ زمانہ تھا میرے بچپن کا، اب تو جوانی کی بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

آہ، دوست وہ بھی کیا دن تھے، کاکش تم نے مجھے جوانی میں دیکھا ہوتا۔ دیوان غالب میں ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، وہ ہے، وہ ہے۔ . . . . آہ اس وقت کم نعت یاد نہیں آ رہا دماغ چکرا رہا ہے لیکن — اچھا۔

ہاں، تو میں ریشماں کے متعلق کہہ رہا تھا لیکن میں ریشماں کے متعلق کیا کہوں۔

ریشماں کی آنکھیں، ان نیلی تپلیوں کی اتھاہ گہرائیاں، وہ آنکھیں

ان دو پاک دسات جھیلوں کی مانند تھیں جو کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہوں، جہاں کسی انسان کے قدم بھی نہ پہنچے ہوں، ریشماں کے نازک لب، شرمسار عجب سے لب، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی نشان ہوں۔ اس کے نازک ہاتھ، مرمری انگلیوں کی پوئیں، جگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین۔ اس کی چال جیسے دوخیز بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آگئی ہو۔ اس کی آواز سنو بہ کے جھگڑوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی غسری کی طرح میٹھی اور اُلتے ہوئے ٹھنڈے چشموں کے ترنم کی طرح لوجدار، اس کا قد، فارسی کا ایک شعر ہے۔ ایک نہایت ہی سوزوں شعر ہے لیکن..... کم نہت یاد نہیں آ رہا، بالکل زبان پر پھر رہا ہے۔ آہ کیا خوب شعر تھا، نظیری کا شعر، نہیں عرتی کا، آہ اب حافظ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا۔۔۔ کچھ یاد نہیں رہتا۔ بھگے لب تو اپنا کلام بھی یاد نہیں، حیرت ہے، ان دنوں میرا حافظہ کس قدر تیز تھا۔

تو یہ تھی ریشماں، پنڈت کی داوی کی حسینہ، بیشک ایک نایاب چیز تھی۔ اور لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے کیلئے آیا کرتے تھے اس کے باپ کو ہر روز ریشماں کے ناطے کیلئے پیغام آیا کرتے۔ کوئی پانچ سو روپے، کوئی ایک ہزار، کوئی ڈیڑھ ہزار اور کوئی سولہ تین ہزار روپے



تک دینے کو تیار تھا۔ لیکن اس کا باپ شاید صرف نفع میں ہی جواب دینا جانتا تھا۔ کم از کم میں نے تو اُسے کسی سے ہمی بھرتے نہیں دیکھا نہ سنا۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا۔ شاید وہ اپنی لڑکی کو کسی بادشاہ کے ہاں دینا چاہتا تھا۔ اوریوں بھی تو ریشماں کس بادشاہ کے گھر کے ہی لائق تھی۔

لیکن، جیسا کہ میں نے کہا، جوانی بری بلا ہے اور جوانی کی محبت اس سے بھی زیادہ خطرناک، میں نے ریشماں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ دنیا میں ریشماں صرف میرے لئے ہے اور میں اس کے لئے۔ اور یہ ٹھان لی کہ چاہے اس کے باپ کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسے اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ لیکن اگر شادی ہوگی تو صرف ریشماں سے، نہیں تو جان پر کھیل جاؤں گا۔ اس کے سارے خاندان کو تو تیغ کر دوں گا۔ سارے گائوں کو آگ لگا دوں گا۔ اس کے سامنے پہاڑی پر سے نیچے نالے میں کود کر مر جاؤں گا، لیکن یہ کبھی گوارا نہ ہو گا کہ میرے بیٹے جی میری ریشماں کو کوئی اور شخص چاہے وہ جاگیر دار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ بیاہ کر لے جائے۔ جوانی میں آدمی کیسی عجیب باتیں کرتا ہے۔ یہ قوفوں کی سی باتیں۔ فضول خطرناک، عاقبت نااندریشیاں۔

تو صاحب! میں نے ریشماں کی محبت میں سر دھڑکی بازی لگا دی۔ لوگوں کو میکہ دیکر لگنا کیا؟ ہر وقت ریشماں کے پیچھے پیچھے

پہرے لگھا۔ پاگل کتے کی طرح، وہ چٹھے پر پانی بھرنے جاتی، توبھے پہلے ہی  
 سو جڑ پاتی، چرواہوں کے ساتھ جنگل جاتی تو میں بھی اپنی تولیے سے در بندوق  
 لئے ہوئے جنگل میں اکسود ہوتا۔ میں ان دنوں گانا بھی اچھا جانتا تھا۔ میرا  
 مطلب ہے کہ میں ماہیا بہت مزے سے گایا کرتا تھا اور اکثر لوگ میرے  
 ماہیا گانے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ کہتے تھے کہ کوئی مرانی بھی اتنا  
 اچھا ماہیا نہیں گا سکتا۔ لیکن اب وہ دن کہاں اب تو دن میں مجھے دل  
 بار کھانسی کی شکایت ہوتی ہے۔ تم شہر میں رہتے ہو۔ کبھی کوئی اچھی سی دوا  
 ہی بیچ دیا کرو۔ ورنہ تمہارے شہر میں رہنے پہنے کا ہیں کیا فائدہ کیوں؟  
 خیر..... ایک دن کی بات ہے میں کسی قریب کے موضع  
 سے چمپک کے نیچے لگا کر واپس آ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور مغرب  
 سے ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں بہت منہموم تھا۔ کیونکہ دن بھر میں گانوں  
 سے باہر رہنے کی وجہ سے دلشماں کے دیدار سے محروم رہا تھا چنانچہ  
 بہت ہی حزیں لہو میں آہستہ آہستہ ظہر

فراقِ باناں میں سہم نے ساقی لہو پیاسے شراب کر کے:

گانا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں اس وقت بہت اُداس تھا۔ میری آنکھیں  
 شاید اس وقت آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ اہ مجھے اپنے آپ پر بہت  
 خیال آ رہا تھا۔ گانوں کی مدد میں داخل ہونے سے پہلے راستے میں

ایک عوبانی کا درخت آتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس عوبانی کے درخت کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تنے کا سہارا لئے اپنی سنہری کاکھلوں کو اپنے نازک شانوں پر پریشان کئے ریشماں کھڑی میری راہ تک رہی ہے۔ میں ہلکے کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمبے چند صدیوں کی طرح گزرے۔ پھر ریشماں بولی اپنی نرم میٹھی آواز میں۔ ”جی آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”اس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، اور تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

ریشماں بولی، ”جی، مجھے سب سبیلیاں ملنے دیتی ہیں۔“ اور پھر اس طرح آپ کا میرے پیچھے پیچھے پھرنا خشک ہنسی، میں آپ کو گالیاں دوں گی، تو پھر آپ . . . . .“

میں نے کہا۔ ”تو میں نے کب منع کیا ہے آپ شوق سے گالیاں دیں۔ میں انہیں سنتا جاؤں گا۔ اور پھر انہیں اکٹھا کر لوں گا۔ پھروں کی طرح پھران کا مار بنا کر اپنے گلے میں پہن لوں گا۔“

ریشماں بولی۔ ”ہم ٹھیریں اُن پڑھ۔ بجلا ہمیں آپ کی طرح باتیں بتانا کہاں سے آئیں۔ لیکن میں آپ سے پھر کبھی ہوں، خدا کے لئے آپ میرا بچا کرنا چھوڑ دیں۔ ابا آپ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں کہتے

تھے۔ اگر وہ لڑکا باز نہ آیا تو اُسے قتل کر ڈالیں گے۔  
 میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”یہ سر حاضر ہے۔ ابھی گردن اُڑا دیجئے  
 اگر اُن کر جانوں تو.....“

ریشماں نے ایک عجب ادا سے سر ہلا کر کہا۔ ”اُسے میں  
 یہ کب کہتی ہوں کہ آپ مر جائیں، لیکن آخر..... آپ چاہتے  
 کیا ہیں۔؟“

”میں کچھ نہیں چاہتا۔“ میں نے اپنا ہاتھ اپنے کپڑے پر رکھ کر  
 کہا۔ ”ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تم یہاں سے چلی جاؤ تو تمہارے  
 پیارے قدموں کی خاک اپنے ماتھے سے لگا لوں اور تمہارا نام لیتا  
 ہوا اسی دم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔“

ریشماں مسکرائی، ایک لڑکی کی طرح نہیں، بلکہ ایک عورت  
 کی طرح مسکرائی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کیلئے مجھے دیکھا۔ پھر  
 وہ پلکیں گلاب کے پھولوں کی طرح خوشنما اور نازک گالوں پر جھک  
 گئیں۔ دوسرے لمحہ بہتے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتی  
 جاتی تھی اور مزہ مزہ کر میری طرف دیکھتی باقی تھی۔

چند لمحے تو میں چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن  
 کھڑا رہا۔ پھر میں نے بھی ریشماں کے پیچھے تیزی سے جاگنا شروع

کر دیا۔ وہ ایک حرفی کی طرح تیز جاگ رہی تھی۔ اس کے منہ سے نہیں  
کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ہم دونوں کے  
درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

اب میں اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ لیکن ابھی اُسے  
چھو نہیں سکتا تھا۔

وہ اب زیادہ تیزی سے بھاگنے لگی۔

لیکن میں اب اور بھی قریب آ گیا تھا اور ہمارے درمیان  
بالکل توڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔

”دیکھو، جہیں..... ہمارا پیچھا مت کرو..... میں

کہتی ہوں یہ اچھا نہیں.....“

ایک چھلانگ لگا کر میں نے اُسے جا دبوچا اور آغوش

میں اٹھالیا۔ ”اب کدھر جاؤ گی؟“

”مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو..... میں گھر جاؤ گی“

اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

میں ایک چنار کے درخت کے قریب جا کر ٹک گیا۔ اور

اُسے سبز روش پر آہستہ سے گرا دیا۔ اور پھر اس کے قریب ہی  
سستے کیلئے بیٹھ گیا۔

”دیکھا تم نے؟ تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔“  
میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اور اپنے پریشان بال درست کرتی رہی۔

ہم گاؤں سے بہت دور نکل آئے تھے۔ شفق گم ہو چکی تھی  
لیکن پھر بھی ندی کا پانی ایک چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا۔  
ہاں پہاڑوں پر اب جنگل دکھائی نہ دیتے تھے۔ اندھیرے کھ  
سیاہی میں غائب ہو چکے تھے کہیں کہیں تارے بھی نکل آئے تھے  
میں نے ریشماں سے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کب نکاح  
کرو گی؟“

”کبھی نہیں!“

”وہ کیوں؟“

”تم تیلی ہو۔ ہم مغل ہیں۔“ ریشماں نے شوخی سے کہا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے؟“ میں نے ریشماں کا

ہاتھ اپنے ماتھے میں لے کر کہا۔ ”کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟“

”ہرگز نہیں!“

”تو پھر تم میرے پاس کیوں بیٹھی ہو؟“

جواب میں ریشماں نے میری طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر کیا ایک کسی خیال کے زیر اثر وہ کانپ اٹھی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

”میں آج خوب پٹوں گی۔ ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے لیکن یہ کہہ تو آئی تھی کہ میں غار کے ہاں جا رہی ہوں لیکن اب دیر بھی تو بہت“

.....

میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ ”تم ایسی شریر لڑکی اسی لائق ہے کہ اسے خوب پٹیا جائے۔“

ریشماں بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم مجھے کبھی نہیں پٹو گے“

میں نے کہا۔ ”ہاں، کیونکہ میں ایک تیلی ہوں اور تم مغل نادی ہو۔“

ریشماں نے اپنا نازک ہاتھ میرے کندھے سے لگایا۔ پھر بے اختیار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

”تم کتنے نازک رہو۔“ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کیا ایک آسمان کے ستارے کھٹکھٹلا کر ہنس پڑے ہیں اور چاند کی روشنی میں سفید سفید بادلوں کے کانپتے ہوئے نازک سائے کسی نامعلوم خوشی کے زیر اثر ناپنے لگے ہیں اور

مغربی بھا کے جھونکے چار کے بتوں میں چپ چپ کر غیر فانی زندگی کے  
 گیت گارہے ہیں۔ میں نے ریشماں کی لمبی لمبی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے  
 ہوئے محسوس کیا۔ کہ یہ خوشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اور  
 جب میں نے دفترِ شوق سے بے اختیار سو کر اپنے لب اس کے  
 لبوں پر رکھ دیئے۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ ان ہونٹوں میں پہاڑی شہد کی  
 سی مٹھاس ہے اور دیکھتے ہوئے انگاروں کی سی گرمی اور جہنم دونوں ہی  
 احساس تھے۔ ایک تکلیف دہ خوشی اور ایک ہاں بخش اذیت۔

اس کے بعد آٹھ دنوں کے کوائف میں تمہیں اچھی طرح  
 نہیں بتا سکتا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی ایک دل خوش کن خواب کی طرح  
 گزر رہی تھی۔ جس میں میں اور ریشماں ہی تھے۔ کچھ عجب سی حالت  
 تھی۔ شراب کا سانس، دلفریب نغموں کا سا سرور، سارا کا دل  
 جنت نظر آتا تھا۔ اور دور سے جاگیر دار صاحب کے پرانے محل کے  
 برج سونے کے کلسوں کی طرح چمکتے تھے۔ عجیب اور پُر اسرار، مجھے  
 ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تمام دنیا، قدرت کی رحمتیاں، پرندوں کے چہچہ  
 بے فکر گذریوں کے قہقہے ہمارے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں میرے  
 اور ریشماں کھیلنے تاکہ شام کے جھپٹے میں ہم دونوں چپ کر اور باہوں  
 میں باہیں ڈال کر گاؤں سے باہر کسی ننھے سے مرغزار میں با میٹھیرے



اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن یہ سب کچھ آٹھ دس دن کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک ظالم وحشی ہاتھ نے ایک پُر زور جھٹکے کے ساتھ میرے دل فریب خراب کو منتشر کر دیا۔

میں اس دن جب ہم دونوں نے گاؤں سے جاگ جانے کی صلاح کی تھی۔ ریشماں کے ظالم باپ نے اُسے جاگیر دار صاحب کے بڑے لڑکے کے حوالے کر دیا۔ یہ تو بچے بعد میں معلوم ہوا کہ بہت دیر سے درپردہ مشورے ہو رہے تھے۔

جاگیر دار صاحب کا بڑا لڑکا بہت ادب و باش ہے جس طرح بڑے آدمیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ ریشماں پر لٹو تھا، کہیں شکار کھیلتے آتے جاتے دیکھ لیا ہو گا۔ بس ریشماں کے باپ پر ڈورے ڈالتے شروع کر دیئے۔ ادھر میری بے خبری کا یہ عالم کہ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ جب ریشماں شہر میں جاگیر دار صاحب کے محل میں پہنچائی جا چکی تھی۔

یہ چوٹ اتنی کاری اور ناگہانی تھی کہ میں اپنے حواس برقرار رکھ سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد دو سال تک میں پاگل سا رہا۔ سوکھ کر بالکل کاٹا ہو گیا تھا۔ درہر گھومتا تھا اور لوگوں سے

کہتا تھا ۔ مجھے بچاؤ ۔ مجھے بچاؤ ۔ وہ بچے کاٹنے کو آرہی ہے ۔ ۔ بس یہی دو کلمات تھے جو ہر دقت میری زبان پر جاری رہتے ۔

منا ہے کہ ایک دفع جب میں جاگیردار صاحب کے شہر میں گھوم رہا تھا ۔ انہوں نے مجھے کہیں دیکھ لیا ۔ اور جب کسی صاحب سے انہوں نے میری راج کھانی سنی تو مجھ پر بہت ترس کیا ۔ اور علاج کیلئے چھکار پور کے پاگل خانے میں بھیج دیا ۔ اور جب میں دو سال کے بعد تندرست ہو گیا تو پھر مجھے اپنے پرانے عہدے پر اسی وادی میں تعینات کر دیا ۔ لیکن اس گاؤں میں نہیں بلکہ دور کے گاؤں میں جہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے ۔

اتنا کہہ کر دیکھی میٹر چپ ہو گیا اور حقہ گود گڑانے لگا ۔ رشید نے

آہستہ سے پوچھا ۔

۰ اور ریشماں ؟ ..... تم نے اُسے پھر کبھی دیکھا ؟

۰ ریشماں جاگیردار صاحب کے بڑے لڑکے کے حرم میں ہے ۔

اگرچہ وہاں عورتیں تو بہت ہیں ۔ لیکن ریشماں کو اپنے مالک کی چہیتی ہونے کا فخر منور حاصل ہے ۔ اس کے دو لڑکے بھی ہیں ۔ .... میں نے اسے آٹھ نو سال ہوئے اس کے باپ کے گھر اسی گاؤں میں دیکھا تھا ۔ جب وہ اپنے بھائی کی شادی پر یہاں آئی تھی ۔ اس کا باپ

اب کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اس گاؤں کا نمبر دار ہے۔ اور علاقے کا ذمیدار۔ اس کا مکان پتھروں سے بنا ہے۔ تم نے راستے میں دیکھا تو ہو گا۔ وہ جس پرٹین کی چھت ہے اور جس کے عقب میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے۔ . . . . میں نے اسے اس باغیچہ میں دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت ریشمیں لباس پہنے ٹہل رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔ وہ اب بھی بے حد خوب صورت تھی۔ اس کی چال شہزادیوں جیسی تھی۔ میں دیر تک باڑ کی اوٹ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

اریشماں جو کبھی میری منکوحہ ہوتی۔ ریشمیں کپڑوں کی بجائے وہ سرخ سوی کی بھاری شلوار اور جینٹ کی قمیص پہن کر میرے اپنے بچوں کو لے کر یوں ٹہلا کرتی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور انہیں پونچھنے کی کوشش کئے بغیر ہی میں باڑ کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ میں نے اُسے سخت فحش کلمات کہے۔ اس کے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ اُسے کے سارے خاندان کو جی بھر کر اور بیخ بیخ کر کوسا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ملا۔ جب تک لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر اور گھسیٹ کر پرے دے گئے۔

• اور ریشماں نے تمہیں کچھ نہ کہا۔ " رشید نے پوچھا  
 • نہیں، مجھے دیکھ کر وہ ششک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے گردن  
 جھکائی۔ اور چپ چاپ گالیاں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے  
 آنسوؤں کے چٹھے بہ نکلے اور اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اپنے  
 دونوں لڑکھوں کو اپنے ساتھ چمٹالیا۔ . . . . بعد میں جب وہ اپنے  
 گاؤں سے چلی گئی تو اس کی ایک پرانی سہیلی نے مجھے بتایا کہ اس سوال  
 پر کہ تم نے وہاں باغیچہ میں کھڑی رہ کر اس کی گالیاں کیوں سنیں ؟  
 ریشماں نے جواب دیا • اس وقت وہ اگر مجھے پیٹ ڈالتا  
 یا جان سے مار ڈالتا تو بھی میں وہاں سے نہ ہٹتی۔ . . . . پھر اس نے  
 کہا۔ اے میری جان سہیلی، وہ گالیاں نہ تھیں بھول تھے۔ میرے محبوب  
 کے جنہیں میں نے چن چن کر اپنے آنسوؤں کے تار میں پرو لیا۔ اور  
 اپنے دل کے مزار پر چڑھا دیا۔ تاکہ محبت کی قبر سوئی نہ رہے۔ . . .  
 لیکن دیکھی میٹر نے غمناک آواز میں داستان ختم کرتے  
 ہوئے کہا۔

• مجھے اب کسی پر غصہ نہیں، کسی سے محبت نہیں۔ میں  
 اب کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔ پہلے چمچک کے ٹیکے مفت لگاتا تھا۔

اب دو آنے لئے بغیر کسی کے بازو کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مجھے کسی کے پرواہ نہیں۔ میں اب اپنا روپیہ ڈیوڑھی فیس پر قرض دیتا ہوں۔ اس گاؤں میں سوائے ریشمال کے باپ کے، سب میرے قرض دار ہیں وہ مجھے کجخوس اور ظالم کہتے ہیں لیکن انہوں نے کب میرا جلا چا ہا۔ ان کا بس چلے تو مجھے آج قتل کر دیں۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں میرے پاس روپیہ ہے زمین ہے بال پتھے میں تین نکاح کر چکا ہوں مجھے کسی کی پروا نہیں کسی سے محبت نہیں، کسی پر غصہ نہیں۔ میں جاگیر دار صاحب کی وفادار رہا یا ہوں۔ ان کا ظلم نہیں۔

”کیا سچ پر تمہیں کسی پر غصہ نہیں آتا؟“ رشید نے تیز لگاہوں سے دیکھی نیٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

دیکھی نیٹر گھبرا گیا۔ آنکھیں نیچی کر کے بولا: ”نہیں سرگز

نہیں۔ میرا دل صاف ہے۔۔ لیکن دوست ....“ اب دیکھی نیٹر نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور رشید کی طرف محبوب لگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا ....

”میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں اور اسے کہتے وقت میرا سینہ پھٹا جاتا ہے اور میں یہ بات تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ بات جاگیر دار صاحب کے اس پرانے محل کے بروجوں کے

متعلق ہے..... میں انہیں دھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر بار بار پاگل ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میرا منہ چڑا رہے ہیں۔ میں انہیں صاف صاف کہتے سنتا ہوں۔ تم ہمیں نہیں جانتے۔ ہم اب بھی تمہاری دنیاؤں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ تمہارے امن و سکون کو خس و خاشاک میں ملا سکتے ہیں۔ تمہاری زندگی کی خوشیوں کو پاؤں تلے روند سکتے ہیں تم ہمیں نہیں پہچانتے لالہ لالہ۔

اور میں پاگل ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں، کہ جب تک یہ چمکتے ہوئے برج موجود ہیں میرے دل کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا بار بار میرے دل میں خیال آتا ہے کہ ایک دو پیسے کا بارود لے کر میں رات کے وقت اس پرانے محل کے قریب جاؤں اور بارود لگا کر بجھک سے ان برجوں کو اڑا دوں تو... تو... لیکن میں نے ہر بار اس مودی خیال کو دل میں زور سے دبا دیا ہے۔ اور دیکھی فیسٹر نے راز دارانہ لہجہ میں رشید کھٹرون جھک کر کہا۔  
”لیکن ایک دن میں اس کام کو ضرور پورا کر کے چھوڑ دوں گا....“

# خوفنا چ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لے کر گھر جا رہا تھا۔ ایک ٹریک اور ایک گھڑی جس میں گوجرانوالے کے سرخ مٹے اور کچھ پتوں کیلئے کھلونے بندھے تھے۔ بس یہ مختصر سا سامان تھا۔ جسے میں نے اترتے ہی کرایہ کے سالم تانگے پر لدوا لیا۔ اور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی اور پھر خالہ اور خالہ کی لڑکی رفعت بھی آئی ہوگی۔ رفعت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملائمت اور اس کے محبوب سے لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آکر کہہ رہی تھی۔ "اوہ بھائی جان — آپ بھی آگئے — اب شو دھنا کا خوشی ناپچ دیکھنے میں خوب لطف آئے گا۔"

جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شو دھنا کے رقص کے



متعلق اخبار میں مضامین پڑھتے تھے۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ عہد ہوگی اور رفعت اور میں اور شوہن کا خونی ناپ۔ رفعت، رفعت، کتنا خوبصورت نام ہے۔ اور مردانہ نام ہو تو عارف، عتیق، محبوب، کچھ ہو لیکن صابر، صابر — یہ نام تو ایسا ہے۔ جیسا کسی چمڑا بیچنے والے وکالتدار کا۔

لیکایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گز سے نے تانگے کو وہ پھولا دیا کہ گھوڑا گرتے گرتے پھا۔ اور مجھے تو گویا دل میں تارے نظر آ گئے۔ اب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی، بھڑ بھڑ، قسم کی گالیوں کی بو پھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف نکتا رہ گیا۔ میں نے سوچا کیا روانی ہے۔ زبان میں کس قدر لوہا ہے کسی پچھے دار تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔

شاہ عالمی سے سیکر لوہاری دروازے تک میونسپل باغ کے کڑی کے چنگے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ اور ہر دس قدم کے فاصلے پر دو تین کاہلی پٹیاں فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں پہنچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق ترقیاتی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ سیلا کے منہ کے قریب تانگے والے کو فدا کرک جانا پڑا۔ یہاں بہت بھڑکتی، بہت

سے لوگ جمع تھے اور دوپار پولیس کے جوان بھی۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ شرط بد کر جا گئے والے دو تانگے آپس میں ٹکرا گئے تھے اور ایک مزدور جو بستر اٹھاتے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا۔ ان دو تانگوں کے بیچ میں آکر بری طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش سڑک پر پڑی تھی۔ اور بستر کا مالک اپنی دھوٹی سنبھالتے ہوئے تانگے والوں کی بد معاشی کا، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا، اور بستر کے لبہ سے لت پت ہو جانے کا بلند اور کرحٹ آواز میں ذکر کر رہا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر بلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ”سب ان تانگے والوں کی بد معاشی ہے۔ دوسرا سپاہی بولا۔ اپنا نام کھٹاؤ لالہ جی۔“

جمع میں مختلف آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ ”اوہو۔ اوہو چ۔“

”چ، مر گیا بیچارہ۔“

”گھوڑے بھی زخمی ہو گئے ہیں۔“

”کم بخت تانگے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی، مگر دیکھتے

اس تانگے والے کا تو کم سے کم سو روپیہ کا نقصان ہو گیا۔“

”اُف.....!“

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چکڑے جمع ہو گئے دیکھتے

دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہو گیا۔ آخر مشکل سے میرے تانگے والے نے بڑکے درخت کے قریب "ہٹو مہربان، لالہ جی ایک طرف، خالص صاحب، سنتری جی، سائیں جی، اومائی پرجا" کہہ کر راستہ نکالا اور پھر گھوڑے کو جو چاہک دکھایا تو لوہاری کے چوک میں پہنچ گیا۔ خواہنے والے کی صدائیں، انارکلی کے اندر گزرتے ہوئے تانگوں میں دلفریب ساریوں کی جھلک، "یہ لاہور ہے" اور سینما والوں کی اشتہاری گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاصے پروگرام، ریجنٹ مین نور اسلام "کراؤن میں" بانگی الفت الغنٹن میں "شاہی لیٹر" "راکسی میں" شانِ قلندر پر بھائی میں شردھنا کا ناپچ -

شردھنا کا ناپچ اور رفعت !

بھائی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا

"مجھے یہیں اتارنا ہے۔"

ایک مزدور نے دوڑ کر میرا سباب اٹھایا۔ اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ تانگے والے نے چار آنے لیکر گھوڑے کا رخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا۔ اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔

مزدور بولا ۔ اسباب اٹھاؤں ؟ جی ہاں ۔

۔ اٹھاؤ ذیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب تو ہے

ایک آنہ دیں گئے ۔

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے لیٹر اور گٹھری

اٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا۔

۔ ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو ؟

۔ جی نہیں، نیا دیا آیا ہوں ۔ اس کا بھج نہایت خوشگوار

اور دیہاتی تھا۔ شہری تصنع سے بالکل پاک ۔

۔ کہاں سے آئے ہو ؟

۔ ملتان سے ۔

۔ خاص ملتان سے ؟

۔ جی نہیں ملتان کے پاس پارو وال گاؤں ہے وہاں

سے آیا ہوں ۔ پہلے لائل پور گیا تھا ۔ پھر مادہر لاہور آگیا ہوں ؟

۔ کیا لائلپور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی ؟

۔ مزدوری تو — ملتی تھی مگر . . . . . بات یہ

ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی . . . . . ہم چار بھائی ہیں ۔ میرے

تین بڑے بھائی بیاسے ہوئے ہیں ۔ مگر میں کنوارا ہوں ۔ دو بڑے

بھائی پارہ وال میں کاشت کرتے ہیں۔ زمین ٹھوڑی ہے گزارہ نہیں ہوتا۔  
 مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری  
 کیلئے ملتان سے لائل پور منڈی آئے تھے اور ایک دن جب ہم  
 گھنٹہ گھر کے قریب سستارہے تھے۔ ہمیں ایک بابو ملا۔ اس  
 نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگا۔ ”مزدوری کرو  
 گے؟“ ہم نے کہا۔ ”کریں گے!“ بولا یہاں کیا لیتے ہو؟“  
 ہم نے کہا۔ ”آٹھ آنے روزانہ“ کہنے لگا۔ ”میں بارہ  
 آنے روزانہ دوں گا۔ لیکن تمہیں ملک وال میرے ساتھ چلنا  
 پڑے گا۔“

ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملک وال چلے گئے  
 وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھو وال لے گیا۔ راستے میں ہمیں تسلی،  
 دیا گیا کہ بڑا آسان کام ہے بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا۔  
 ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی۔ لیکن سوچا اس میں کیا  
 ہے کریں گے،

سدھو وال جا کر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال  
 تھما دی۔ اور ریلوے لائن پر لے گیا۔ اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ  
 یہ زمین کھودنی ہے اور جتنے فٹ زمین ہوز کھودو گے اس کے

حساب سے تمہیں پیسے ملیں گے۔ اس حساب سے میں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن رات کو ہم دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا۔ اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا۔ پھر مسم میاں آ گئے یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں۔ وہاں بارہ بجے تک چار آنے ہو جاتے ہیں۔ پھر مسم دن بھر ادھر ادھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو بن گئے لیکن عام طور پر پانچ چھ آنے سے زیادہ مزدارہ کائی نہیں ہوتی۔

میں نے پوچھا۔ ”تم رات کو رہتے کہاں ہو؟“

”جی داتا کے دربار میں۔“

”وہاں جگہ ہے؟“

”مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے اور پھر ہم انہیں

غوش بھی کر دیتے ہیں۔“

”اچھا؟“

”جی۔“

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا۔ نیا عید سلنے مٹی میں کھیل

رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توکی زبان میں چلتا  
 اٹھا۔ ”بھائی جان آؤئے“ اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔  
 دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گھٹری فرش پر رکھ  
 دی۔ اور ایک طرف ہو کر پسینہ پونپھنے لگا۔ اب گھر کے سب لوگ  
 میرے گرد جمع ہو رہے تھے اور پُرمسرت لگاہوں سے میری طرف  
 دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں، خالہ اور رفعت، رفعت  
 کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔  
 منجھلا بھائی بولے۔ ”مہم تو صبح کی گھاڑی سے آپ کا  
 انتظار کر رہے تھے۔“

اماں بولیں۔ ”رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟“  
 رفعت نے ہنستے ہنستے کہا۔ ”بھائی جان ہم تو آج ہی شوہن  
 کا ناپ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

مزدور کو سننے میں سے بولا۔ ”بھئیے جلد دیجئے، میرا  
 بھائی انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کیساتھ  
 بستر آشاکر گیا ہے۔ اور اب واپس آکر دانا جی کے دربار میں انتظار کر  
 رہا ہوگا۔“ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ ”کچھ انعام بھی مل جائے۔ کل حید  
 سبے بابو جی۔“

میں نے حیب میں ملکہ ڈالا اور پھر کیا ایک میرا ملکہ گر گیا میرا  
سارا جسم کا پھٹنے لگا۔ میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے۔  
رفت کی سکرابٹ بھلتی ہوئی ساری فضا میں عجیب حلقے بناتی ہوئی  
دکھائی دی۔

شو دھنا کے تھساں پاؤں میں بندھے گھنگرو زور زور سے  
چیمنے لگے۔ ساری کائنات لرز رہی تھی۔ انارکلی میں گزرتے ہوئے  
تا نگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے فضا میں لڑھکنے لگے۔  
اب چاروں طرف غن ہی غن تھا۔ اور دوپھرائی ہوئی آنکھیں اس میں  
سے باہر جھانک رہی تھیں۔ اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے  
بھنبھانے کی گوبخ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "اے بے پتہ پتہ  
تج بے چارہ مر گیا۔"





# دل کا چراغ

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، تو چار بجے تھے اور خواب گاہ  
 کی کھڑکی کے سامنے سڑک کے اس پار کچھ دکاندار کی دکان سے  
 مسکھٹنی جی کے پاٹھ کی آواز آرہی تھی۔ بلجے سے صدق، عجز اور  
 پاکیزگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن آواز ذرا مہنجی ہوئی تھی۔ اس لئے  
 برابر چلی آرہی تھی۔ ایسی آواز جو اپنی پاکیزگی کے باوجود میرے کانوں  
 کو تیز معلوم ہوئی۔ گویا کہہ رہی تھی۔

، مردود تھے اپنا خالق کا کچھ پاس نہیں، کیسی میٹھی نیند  
 سو رہے، شرم نہیں آتی تھے، دیکھ ستارے ماند پڑ رہے ہیں  
 مشرق سے روشنی پوٹ رہی ہے اور میں اپنے قادرِ مطلق کی  
 تعریف کا گیت بن کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں۔ اُٹھ اُٹھ بے شرم

کا: ملکہ، دہریے، آواز اونچی ہو رہی تھی۔ تھراتی ہوئی لڑتی ہوئی گویا اپنے آپ کو ربِ عظیم کے آستانے پر نچاؤ کرتی ہوئی میری کھڑکی کے اندر چلی آ رہی تھی۔ میں نے نیند سے بھرے ہوئے چوٹوں کو اٹھائے بغیر ہی کھڑکی کے پرچے گرا دیئے۔ کھڑکی بند کر دی اور لحاف منہ اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر سو گیا۔ لیکن میرے اللہ وہ آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اور اب تو گویا پتلا پتلا کر کہہ رہی تھی، اُٹھ اُٹھ :

”اُٹھ فریادِ ستیا تے من دادیوا بال“

(اے سوئے ہوئے فرید اُٹھ اور دل کا چراغ روشن کر لے)

گو میرا نام فرید نہیں لیکن پھر میں نے اب بھی مناسب سمجھا کہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میز پر پڑے ہوئے ٹیبل لیمپ کو روشن کر دوں۔ جب کمرے میں اجالا ہو گیا۔ تو روشنی اور آواز دونوں نے مل کر نیند کا میٹھا تکین وہ خمار میری آنکھوں سے بالکل دور کر دیا۔ اب مجھے آنکھوں میں ایک جلیں اور جھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ آواز نہ تھی بلکہ سوئیاں اور کانٹے تھے جو میری آنکھوں میں چھب رہے تھے۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول دی۔ ایک زناٹے وار آواز آئی۔

”اُٹھ فریادِ ستیا تے من دادیوا بال“

• صاحب بنحال دے جاگدے نغراں کی سونے نال •

راور جب تیرا صاحب جاگ رہا ہو تو اسے ہرے کے بچے جتنے  
سونے کا کیا حق ہے ،

بالکل درست ، پیر و مرشد ، بالکل درست ، آج کی خطا معاف

ہو ، کل اگر چار بجے سے پہلے ہی دانتوں تو پھر ————— بھلا  
آپ کی آواز ہی مجھے کیوں پہن لینے دے گی ۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سامنے سکھ دکاندار کی دکان

پر کوئی جھاڑو دے رہا تھا ۔ نین کے ڈبوں کو جھاڑ کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا ۔

آٹے اور دال کی بھریوں کو اٹھا اٹھا کر ترینے کے سجا رہا تھا ۔ یہ وہ

بیچارہ کوتاہ قد زرد رو سکھ دکاندار تو نہ تھا ۔ یہ تو کوئی اور تھا ۔ شمع

کی بجلی سی لو میں اس کی لمبی پرچائیں ، اس کا چست پائجامہ اور کانڈھوں

کے گرد لپٹا ہوا اکھیں نظر آ رہا تھا ۔ یا پھر وہی صدائے برحق ۔

• گنگن گاویں تے من بھاویں • (اپنے گورو کی تعریف

کر تاکہ تو اس کے دل میں گھر کر سکے ،

جی !

گنگن گاویں تے من بھاویں

جی !

جی ! بالکل درست ، پیر و مرشد ، بالکل درست ، اگر میں اپنے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی دن رات خوشامد نہ کرتا تو آج محض ایک اینٹ اے نیل ۔ ہو کر پچتر روپے تنخواہ نہ پاتا ۔

• جی است سری اکال ! • اب وہ لمبی پرچائیں دکان کے باہر آگئی تھی جس نعرے نے گور و ناکہ نگر کے در و دیوار ہلادیتے تھے ۔ وہ نعرہ میری کھڑکی کھلی دیکھ کر ہی لگایا گیا تھا ۔  
• آہا ، بابو جی ، آج تو آپ • بڑے سویرے • اُٹھ بیٹھے •  
لمبی پرچائیں نے کہا ۔

میں نے مسکراہٹ کی کوشش کی ۔

• بابو جی ، سویرے اٹھنا بہت اچھا ہوتا ہے ۔ اب تو خیر بہت اُجالا ہو گیا ہے ۔ •

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی ۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ابھی تو چار ہی بجے تھے ۔ ستارے چمک رہے تھے اور بجلی کے کھمبوں پر قہقہے بھی ۔ اُجالا کہاں ہے ۔ میں نے سوچا ، پھر خیال آیا ۔ کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں ۔ تو بے وقوف انہیں کیا جانے ! جس کے دل میں اُجالا ہوتا ہے ۔ اُسے ہر طرف اُجالا ہی اُجالا دکھائی دیتا ہے ۔

میں نے پوچھا، " یہ — دکان کے — نند سنگھ  
 جی کہاں ہیں؟ "

" گھر پر ہی ہیں جی، وہ تو ابھی سو رہے ہوں گے جی، میں نے  
 سوچا چلو، ان کے گھر مہمان بن کر آیا ہوں تو کچھ سیوا ہی کر لوں، کر سیدا  
 کھا میوہ۔ میرا نام درشن سنگھ ہے جی، میں نند سنگھ جی کے بڑے  
 سائے کا بڑا لڑکا ہوں، جی، میں نورپور میں گرتی ہوں۔ نند سنگھ جی  
 ذرا بیمار رہتے ہیں۔ انھیں مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی  
 ہوگا۔ واہگورو مہاراج سب کا بھلا کرے تو — انھوں نے مجھے  
 یہاں بلا لیا ہے ذرا دکان کے کام کاج میں مدد دے جاتی ہے۔ میں  
 یہیں دکان پر سویا کروں گا۔ واہگورو، واہگورو، اب تو دن چڑھ گیا  
 ہے۔ اوبنے اوبنے، اٹھ دکان کھول، کیا دیکھتا ہے۔ دن کبھی  
 کا نکل آیا ہے۔ "

درشن سنگھ بٹنے کو آوازیں دینے لگا تھا۔ بیچارہ بنیا

اس مکان کی غلی منزل میں جہاں میں رہتا ہوں۔ آٹا، لون، تیل،  
 بھری سوڈا واٹر، اور کھوٹے بیچتا ہے۔ اس کی بیوی کا رنگ  
 ذرا کھلتا ہوا سا ہے۔ اور وہ ہمیشہ عینا کی طرح چہکا کرتی ہے۔  
 دکان پر کام کرتی ہے۔ گاہکوں کو مسکرا کر سودا دیتی ہے، لنگو کے

کنولڈے لڑکے، بد صورت بیویوں کے ادھیڑ خاوند، پورے دھوپ،  
 ٹائی، سوچی اور کھانے میں کشتی لڑنیوالے پیلوان بھی بننے کی دکان  
 سے سودا لیتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر پکھڑے کھاتے ہیں۔ بڑی رغبت  
 سے یا بننے کی بیوی سے، سوڈا واٹر کی ایک بوتل کھول دینا، اور آج تو  
 بنیائیں خوب نبی غنی ہو، "ہی ہی ہی . . . . ."  
 اور بننے کی بیوی بوتل سے کاگ اڑاتے ہوئے کہتی ہے  
 "ہٹ مردو . . ."

دوسرے دن درشن سنگھ کے پہلے مصرعے نے ہی مجھے لگا  
 دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو کم نعت پورے چارتھے۔ میں نے سوچا یہ  
 آدمی ہے یا گھڑیاں۔ میں نے لحاف میں منہ چپا کر اپنی بد نعتی پر رونے  
 کی کوشش کی۔ لیکن جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کیسے آتے۔ میں نے  
 درشن سنگھ کو، اس کے آبا و اجداد کو، اپنی قسمت کو، فرید بابا کو لاکھ  
 لاکھ کو سنے دیئے۔ اتنے میں میں نے سنا کہ غلی منزل سے بھی  
 ایک بلی بلی صدا اُٹھ رہی ہے۔

اوم ہے جگدیش جہے

ہے جگدیش جہے اے اے . . . . .

بنیا اپنی پٹے ہوئے ڈھول کی س آواز میں گارم تھا۔ وہی صدق  
 ججز، اور پاکیزگی، لیکن کچھ خاص قسم کی تیزی۔ جو گویا درشن سنگھ سے کہہ  
 رہی تھی۔ تم ہمیں کیا سمجھتے ہو، ہم تم سے بیٹے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا  
 کچھ کم پیارا نہیں۔

اوہ نہ!

اور اب بنیا اور اس کی بیوی اور دونوں بچے اپنی ملی جلی  
 آوازوں کیساتھ کہہ رہے تھے۔

”جگت چن کے سنگٹ چن میں دور کرے“  
 (وہ اپنے بھگتوں کے دکھ ایک پل میں دور کر دیتا ہے۔)

اوم  
 جے جگدیش ہرے اے اے۔  
 اور بننے کی بیوی کوئل کی طرح کوک کوک کر کہہ رہی تھی۔  
 تم بن اور نہ دو جا۔  
 تم بن اور نہ دو جا۔  
 آس کروں جس کی۔

اوم جے جگدیش ہرے ہرے۔  
 ایک درمیانی وقفے میں درشن سنگھ نے خوش ہو کر بنے



سے اونچی آواز میں کہا۔  
 "بنیادی، آہا راگجورد کا نام لینے میں کتنا آند ہے؟"  
 بننے نے پرخسوس بے میں کہا۔ "آہا رام کی مہا —  
 اور پھر اکھیں بند کر لیں۔"

دشمن سنگھ کے آتے ہی ننگو میں دھرم کرم کے چرچے  
 ہونے لگے۔ یہ ننگو لاہور ہی کی آبادی کا ایک حصہ ہے یہاں اس نے  
 کوئی خاص مذہبی مجلس قائم نہ ہوئی تھی۔ لے دے کر ایک سنگھ سبھا  
 تھی۔ جس کا اجلاس سال میں شاید ایک مرتبہ ہی ہوتا تھا۔ جس مکان  
 میں میں رہتا تھا۔ اس سے بس دس پندرہ قدم آگے جا کر مغرب کی  
 طرف ایک مسلمان قلعی گر، ایک مسلمان رنگساز، ایک مسلمان حکیم اور  
 ایک مسلمان سائیکل کے مستری اور ایک مسلمان بڑی فروش کی دکانیں  
 تھیں۔ ان سے آگے کھلی جگہ تھی۔ جہاں اکھاڑ بنا ہوا تھا۔ یہاں سکھ  
 مسلمان، ہندو اور چار پہلوان سب اکٹھے ہو کر کشتی لڑا کرتے تھے  
 لیکن دشمن سنگھ کے آتے ہی لوگوں میں گویا صدق و ایمان  
 کی روح پھونکی گئی۔ ست سری اکال اور اوم جے جگدیش ہرے کے بعد  
 مسلمان رنگ ساز نے یہ مناسب سمجھا کہ نور ایمان مرقہ دلوں میں تازہ

کیا جائے۔ چنانچہ اب کچھ دنوں سے اس کی دکان پر ایک سبز منگوں والے اور سبز چٹھے والے پیر جو بیک وقت پیر اور مولوی اور عامل تھے تشریف لانے لگے۔ اب رنگ ساز کی دکان پر ہمیشہ ایک بمبکٹا سا لگا رہتا تھا اللہ اکبر کی سدا میں بند ہوتی تھیں اور سائیکلوں کے مستری کے نوجوان لڑکے یا علی یا علی کرتے اور غش سے ناپتے ہوئے گزر جاتے تھے مسلمان سبزی والے کا تمباکو کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ اور حکیم صاحب ایک دن اپنے چھوٹے لڑکے کو بننے کی دکان پر پکڑیاں کھاتے — دیکھ کر غصے میں آکر پٹینے لگے۔

پھر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولے: ”یہ کم بنت ہمیشہ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ میں نے اسے سو بار سمجھایا ہے۔“

چند روز کے بعد جب میں ایک شام کو دفتر سے تھکا ماندہ ، واپس آ رہا تھا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ نگر کا بازار جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے اور بازاروں میں سسٹکھ سبھا کے والیٹر ٹولیاں بتائے جگہ جگہ کھڑے ہیں۔ جن میں سے کئی ایک نے گلے میں ہار پہن رکھے ہیں۔ اکثر لوگ پان چہارہے ہیں۔ تھپتھپے لگا رہے ہیں۔ ننھے ننھے سکھ لڑکے بھی کرپا نہیں پہنے ہوئے ہیں اور آبلے ہوئے چنے کھا رہے ہیں۔ یا

کھٹے کپالو، ریا پٹیلوں میں جمی ہوئی سرخ سرخ پینی گھاس کی کیر،  
 درشن سنگھ نے مجھے دیکھتے ہی ست سری اکال کا جے کارہ  
 لکھایا۔ "آہ، بابو جی، آج بابا جی رہا ہو گئے۔"

۔ کون سے بابا جی ؟

"واہ۔۔۔۔۔ آپ کو بھی پتہ نہیں، آپ تو روز اخبار  
 پڑھتے ہیں۔ وہی داگجرو جی کے پچھے خالصہ بابا نیک سنگھ جی۔  
 بنیے کی دکان پر کھڑے ہوئے ایک والٹیر نے کہا، زلفہ شہید  
 بابا نیک سنگھ جی رہا ہو گئے ہیں۔ آج ہم ان کو ایڈمس دیں گے۔  
 بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

ساتھ دوائے مسلمان قلعی ساز کی دکان پر شہید گنج کا مسئلہ چھڑا  
 ہوا تھا۔ اوند گروا گرم۔ بحث ہو رہی تھی۔

دوسرے دن میری نیند روز کی طرح اُچاٹ ہو گئی۔ لیکن  
 باقی آوازوں کے ساتھ ہی ایک ریکارڈ بھی بج رہا تھا۔ مکان کے دوسرے  
 حصے میں میری طرح ایک اور کرائے دار رہتا تھا میری ہی طرح ایک  
 دفتر میں ملازم تھا۔ اور اب وہی منہ اند میرے اُٹھ کر ریکارڈ بجا رہا تھا۔  
 ٹوبے کے قریب وہ مجھے میٹرھیوں پر ملا۔ میں نے  
 ایک پسیکی سکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ "آج تو آپ صبح

ہی اُٹھ بیٹھے ۔

”ہو ہو ہو“ بابو جی نے ہنستے ہوئے کہا : ”اُٹھا ، اُٹھا ، مجھے مہاتما جی کا ریکارڈ بہت پسند ہے ۔ آپ کو پتہ ہے ۔ مہاتما جی کو یہ گیت خاص طور پر پسند ہے ۔“

”کونسا گیت ؟“

”یہی جس کا میں سچ — ریکارڈ بھارا ہوا تھا ۔“ اُٹھ جاگ  
مسافر بھور بھئی ۔ ”کیسا میٹھا گیت ہے ۔ اسے سچ سن کر طبیعت بشک  
ہو جاتی ہے ۔“

اور پھر وہ یہ گنگنا تا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُڑ گیا ۔  
”اُٹھ جاگ ، اُٹھ جاگ ، مسافر بھور بھئی ، اب رین کہاں ، جو  
سوت ہے اے ۔ اے ۔“

پرسوں ایک مادہ ہو گیا تھا ۔ گوشت سے بھرے چکڑے  
یا تانگے بوجھ ڈھانے سے آتے ہوئے اسی طرف سے گزرتے ہیں  
میں نیپلنی کی سڑک پر بہت سے گڑھے پڑ جانے کی وجہ سے اکثر  
چکڑوں کے بیل یا تانگوں کے گھڑے چوٹ کھا کر گر پڑتے ہیں ۔ اور  
کئی بار گوشت زمین پر گر جاتا ہے ۔ چنانچہ پرسوں بھی ایک تانگہ ۔

سکھ دکاندار کی دکان کے سامنے الٹ گیا۔ اور گوشت دکان کے قریب زمین پر گر پڑا۔ سانچے والے کو بہت سی چوٹیں لگیں۔ چنانچہ پرسوں شام ہی کو پریم سبھا کے سیکرٹری میرے پاس آئے۔ اور بولے۔  
 "اس کا تدارک ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے منسپالٹی کو لکھ دیجئے۔"  
 بولے۔ "نہیں آپ میری بات نہیں سمجھتے۔ یہ راستہ ہی بوجڑوں کے لئے بند ہو جانا چاہیئے۔ یہ منہ دسکھ آبادی ہے۔ ہماری توہین ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کے آپ دیکھئے نا، یہاں چوٹے پتے، لڑکے بالے گھومتے رہتے ہیں اگر کسی کے چوٹ لگ جائے اگر کوئی مر جائے تو —————۔"  
 میں نے کہا یہ تو درست ہے مگر بوجڑ خانے کا بھی تو یہی راستہ ہے اور —————۔

پریم سبھا کے سیکرٹری بولے۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں اخبار میں خبر بھیجنے کیلئے ایک مسودہ بنا دیجئے۔"  
 میں نے کہا۔ "پریم سبھا کب بنی ہے؟"  
 وہ بولے۔ "تین چار دن ہوئے۔ یہاں چار پانچ جہتوں نے مل کر بنائی ہے۔ آپس میں مل بیٹھا اچھا ہوتا ہے۔"

۱۔ پنڈت سدھ دیو کے دو بیکھر بھی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ آئے  
 ہوئے تھے آپ کہاں رہے؟ ۲۔  
 میں۔ میں۔ — میں نے کہا۔ انھیں مضمون پر بیکھر  
 ہوئے تھے۔

۳۔ جاپان میں ویدک دھرم۔ نہایت اعلیٰ لیکچر تھا۔ پنڈت جی  
 نے ثابت کر دیا کہ ساری دنیا ویدک دھرم قبول کرنے کو تیار ہے۔ مگر  
 ہم لوگ بہت سست ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ساری دنیا میرے  
 اپنے پرچارک بھیجنے چاہییں انھوں نے بتایا کہ.....  
 میں نے کہا۔ میں کل آپ کو مسودہ تیار کر دوں گا۔

دوسرے دن صبح ہی یہاں ایک فساد ہو گیا۔ ہندو۔ مسلم کے  
 فساد۔ خوب گھسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری نوآبادی میں جہر اس پھیل گیا  
 ہاتھ دے کر کرپانوں اور چھروں سے حملے ہونے لگے۔ سکوں کی کرپاؤں  
 نے، بوجھلوں کی چھروں نے پوریوں کی لاشیں نے خوب داؤد شہادت  
 دی۔ صبح سے لیکر دوپہر تک نعرے بلند ہوتے رہے۔

پریم سبجاکے سیکرٹری نے شام ہی کو للکار کر کہہ دیا تھا  
 کہ بوجھلوں کو اس بازار میں سے گزرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔  
 بوجھلوں نے سر بازار کہہ دیا تھا کہ "صبح اسی شرک پرست

گزرے گے اور ضرور گزریں گے اور دیکھیں گے کہ کون مائی کا لال انہیں روکتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی بوجھ اپنے چکڑوں اور تانگوں پر گوشت لاوے ہوئے گزرنے لگے۔ بھی خاموش تھے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انہیں روکتا۔ کہ اتنے میں دشمن سنگھ نے لاکارا۔

• ٹھہر جاؤ۔ اور کرپان لے کر میدان میں آگیا۔

مسلمان رنگ ساز نے کہا • اللہ ہو۔ اکبر۔

بنیا جلد جلد اپنی دکان بند کرنے لگا۔ وہ اسی دکان میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے بھی چلی منزل کا بڑا دروازہ بند کرا دیا۔ اور پھر تماشا دیکھنے کے لئے کھڑی میں آ بیٹھ لیکن ذرا ہٹ کر، تاکہ کہیں کوئی اینٹ میرے ہی نہ آ گئے۔

پریم سبھا کے حمایتی پوریوں نے بلہ کر کے مسلمان حکیم اور رنگ ساز اور سائیکل اور سبزی والے کی دکانیں لوٹ لیں۔ سکھ اور بوجھ لڑ رہے تھے۔ اتنے میں گھائی دروازے سے ملک پہنچ گئی۔ اور مہنت نگر سے پھرے ہوئے ہندو بھی۔ میں نے مصلحتاً کھڑکی بند کر دی۔ میری کھڑکی پر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں۔ بیٹے کی دکان توڑی جا رہی تھی۔

پہنیں، درد ناک، ہیبت ناک چمچیں، نعرے، ٹلک ٹلکات  
نعرے، لاشیوں کے چلنے کی آوازیں۔

دکانوں کے دروازے ٹرنے کی آوازیں۔

دو تین گھنٹوں کے بعد ایک نعت چاروں طرف موت کی سی

خاموشی چھا گئی۔ اب فساد مہنت نگر سے آگے بڑھ کر دوسرے

محلوں نو آبادیوں اور شہر کی گلیوں کو چوں میں پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا

دور دور نغروں کی صدا میں بلند ہو رہی تھیں نسکین یہاں —

موت کی سی خاموشی تھی۔

میں نے چند منٹ کے سکوت کے بعد آہستہ سے کھڑکی

کا پٹ کھول کر دیکھا۔

دکانیں لٹی پڑی تھیں۔ اشیاء بازار میں بکھری ہوئی تھیں۔

چند بوچھا اور سکھ مرے پڑے تھے۔ کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے

جن میں میرا پڑوسی بنیا بھی تھا۔ اور اس کی بیوی بھی، جو اسے بچانے

کی کوشش میں بڑی طرح زخمی ہو گئی تھی۔ وہ میری کھڑکی کے نیچے

پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر اس کی وہ تصویر میری

آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں نے اسے ایک دن غلی منزل میں

راکھی کے روز دیکھا تھا۔ میں دالان میں کھڑا سائیکل صاف کر رہا



تھا کہ وہ بے عا شا بھا گئی ہوئی آکھڑی ہوئی۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ ،  
 رنگین کنارے والی دھوئی اور سڈول بازو ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا تھا  
 کہ ساری دنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی ہے ۔ اور پھر دوسرے  
 لمحے ہی میں وہ میرے سامنے سے غائب ہو گئی تھی ۔ لیکن اس کی  
 وہ حسین تصویر ، وہ رنگین پرچائیں ایک عرصہ تک میرے آئینہ دل  
 پر لڑتی رہی تھی ۔

ادب ۹

جب میں نے پھر کھر کی بند کی تو سائیکلوں کا بوڑھا ماسٹری  
 اپنے نوجوان لڑکے کی لکاش کو اپنے کانڈوں پر اٹھانے کی کوشش  
 کر رہا تھا ۔



فساد کو ایک عرصہ ہو چکا ہے ۔ اب یہاں امن امان ہے ۔  
 فجو اور ماما دین کو پچاسی کی سزا ہو چکی ہے ۔ بنیا اپنے بال بچوں  
 کو لیکر رہتک چلا گیا ہے ۔ بوڑھا ماسٹری جس کے دونوں بچے فساد  
 میں ہلاک ہو گئے تھے ۔ اب گردن جھکائے سائیکل درست  
 کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ درشن سنگھ کا کوئی پتہ نہیں ۔ نند سنگھ نے مجھے  
 ایک دن آہستہ سے بتایا کہ وہ آج کل شکار پور میں گرختی ہے ۔ اور

اب اس نے اپنا نام سکسہدین سنگھ رکھا ہوا ہے مسلمان رنگیز نے کہا۔  
کہ سبز چغھے والا مولوی آجکل جلال پور کی مسجد میں امام ہے۔ اب آہستہ  
آہستہ لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح ملنے جلنے لگے ہیں۔

پہلے سبھا کا سیکرٹری، اب رادھا نگر میں رہتا ہے۔ بوچڑ  
لوگ گوشت کو ڈھانپنے ہوئے اسی طرح مشرک پر سے گزرتے  
ہیں۔ مشرک پر نیو سٹی کے گڑھے اسی طرح موجود ہیں۔ لیکن تعزیری  
پولیس ضرور تعینات کر دی گئی ہے۔

اب مجھے صبح چار بجے کوئی نہیں جگاتا۔ بابو جی، جو دوسرے  
حصے میں ہیں۔ اب ریکارڈ نہیں بجاتے۔ کیونکہ وہ فساد میں ٹوٹ  
گئے تھے۔ اب کوئی دل کا چراغ روشن کرنے کی کوشش نہیں  
کرتا۔ اب بالکل امن ہے۔ لیکن میں پھر بھی احتیاطاً اخبار میں ہر صفحہ  
شکار پور اور جلال پور کی خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں !!!



# سفید پھول

موضع مہنڈ کے موپی کا نام کبالا تھا۔ کبالا کو آج تک کسی نے گالی دیتے یا جھوٹ بولتے نہ سنا تھا۔ طبعی شرافت کے علاوہ شاید اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہ پیدائشی گونگھا تھا۔ یوں بھی تو مہنڈ کا گاؤں بودھوں کا گاؤں تھا۔ جہاں ہر ایک فرد سچائی اور اپنا کا پجاری تھا۔ لوگ جھوٹ بہت کم بولتے تھے۔ چوری چکاری اور ڈکیتی کا نام تک نہ تھا۔ پہلے دو سو برس میں وہاں قتل کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی تھی۔

لوگ مہنڈ میں اس طرح خوش و غرم رہتے تھے جیسے جنت میں۔ یہ بات الگ ہے کہ سماج کی الجھنوں میں پھنس کر گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایسے کام بھی کر بیٹھتے تھے۔

جن پر انھیں بعد میں پھٹنا نا پڑتا تھا۔ لیکن ایسی باتیں بہت کم پیش آتی تھیں اور پھر یہ تو سماج کی انھنوں کا قصور تھا۔ نہ کہ ان کا۔

کب لالہ کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب دیو دار کے دو - مضبوط درختوں کے سائے تلے، لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی۔ اور یہ کب لالہ کی دکان بھی تھی۔ اور اس کا آبائی گھر بھی - مہندر کا خوب صورت گاؤں نیچے تلٹی میں واقع تھا اور جب ہوا دیو دار کے درختوں میں گزرتی ہوئی گیت گاتی اور سودج دیوتا اپنے سنہری رتھ پر سوار ہو کر اپنے دیو داروں کی چوٹیوں کے اوپر سے گزرتے تو نیچے تلٹی میں گاؤں کی خوبصورت منقش چھتیں اور پرانے بودھ مندر کا منگولی برج شام کی سنہری کرنوں میں جگمگ جگمگ کرنے لگتا۔

سودج نکلتے ہی کب لالہ دکان کے باہر ایک چوٹے سے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ بیٹھا اور جوتیاں بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دور نیچے راستے پر گزرتی ہوئی مہینوں کی طرف دیکھتا۔ جو مٹی کی گاڑیں گولھو پر رکھے یا سر پر اٹھائے قطار باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی جاتی تھیں۔ اور جب وہ پگڈنڈی پر سے گزر جاتیں۔ تب بھی وہ اُن

ہی کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت کبال کو ایسا محسوس ہوتا گویا ان کے  
 پاؤں سے چھوہلنے سے راستے کی مٹی کا ہر ذرہ کندن بن کر دمک  
 رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اس کے دل کے  
 اندھیرے میں ایک سونے کی گیر سی کھینچ جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا  
 کہ وہ زور زور سے گائے۔ یہاں تک کہ دور نیچے راہ چلتی ہوئی  
 ماہ جبینوں کے پاؤں رک جائیں اور وہ نازک اندام سر و قد ڈینا  
 گاؤں کے نمبر دار کی لڑکی بھی ایک ہاتھ گاگر پر رکھے اور دوسرے  
 ہاتھ سے دھوتی کا پیلا آچھل سنبھالے اس کی طرف تکتے لگ جائے۔  
 اور..... چوٹی کے اوپر چھوٹے سے نیلے آسمان میں اڑتے  
 ہوئے بادل یکا یک تھم جائیں اور اس کا پر سوز گیت سننے کیلئے  
 اونچے اونچے دیو داروں کے اوپر جھک جائیں — لیکن  
 جب کبالا اپنے لب کھولتا تو اس کے منہ سے ایک دہی سی  
 چٹ نکل جاتی، کرخت اور بلند، جسے سن کر اس پاس کے درختوں پر بیٹھے  
 جوئے نازک مزاج ککوا، منہولے اور رت گلے پر پھڑپھڑاتے جوئے  
 اڑ جاتے اور کبالا خرمندہ ہو کر اپنے لب زور سے بیخی لیتا۔ جیسے  
 انیس سوت کے ٹانگوں سے اس نے خود ہی سی دیا ہو۔  
 کبالا کی صورت شکل بہت اچھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی

آنکھیں کسی وحشی حرن کی سی تھیں اور چہرہ بیضی، اور جب وہ اغروٹ کے درخت کے تلے زانو دے کئے جوتے بار بار ہوتا تو اس کا پاک اور معصوم چہرہ بالکل کسی دیوتا کی طرح معلوم ہوتا۔ صورتیں کس قدر دھوکا دیتی ہیں۔ کبالا کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ آج سے دو سو برس پہلے اسی موچی کے ایک بزرگ نے اس گاؤں کے ایک غریب بدو سادھو کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ کیونکہ اسے شک تھا کہ بودھ سادھو اس لڑکی کو درغلارہا تھا جس سے کبالا کے اس بزرگ کو محبت تھی۔

گھاؤں میں قتل کی واردات شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اور گاؤں کے بچوں نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی جان کے بدلے دوسرے کی جان لینا اُدھرم ہے۔ اس لئے انہوں نے کبالا کے بزرگ کو گاؤں سے باہر نکال دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ جب تک اس خاندان کے سات پشتیں اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کر لیں۔ اس خاندان کے کسی فرد کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ گاؤں کی حدود کے اندر قدم رکھ سکے۔ اس دن سے لیکر گاؤں کے موچی کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع تھی۔ گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا

برف چارپشتوں سے مہنڈر کے موچی نے گاؤں میں قدم نہ رکھا تھا۔ وہ بہت سی چیزیں کھنیتر کے گاؤں سے لے آتا تھا جو مہنڈر کے کوہساروں کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی وادی میں واقع تھا اور اب تو کھنیتر کے موچی خاندان سے مہنڈر کے موچی کے تعلقات اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ مہنڈر کے موچی کا خاندان بودھ نچوں کی سزا کو قریباً بھول گیا تھا۔

ہاں! نوجوان کبالا کے دل میں کبھی کبھی ایک ملکی سی تمسُ اُٹھتی کیونکہ وہ نوجوان تھا اور اکیلا اور گونگھا، اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور کھنیتر کے موچی خاندان کے افراد اس کے گونگھا ہونے کی وجہ سے اس سے متنفر تھے اور اوائی اور ذی کشی دلوں بہنیں اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کی دلچسپ حرکات کی جن سے وہ اپنی زبان کا کام لیا کرتا تھا، بے تعلقیں اُتارتی تھیں اور جب ان کے ہنسی ٹھٹھے میں اُنکے تینوں بڑے بھائی بھی شامل ہو جاتے تو گونگھے کے دل کا زخم دس دس کر بننے لگتا۔ اور وہ چنچیں مار کر وہاں سے بھاگ جاتا۔

کبالا کا ایک دوست بھی تھا اس کا نام تھا کھنڈا۔ کبالا نے کھنڈا کو ایک دن کھنیتر سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑا پایا تھا۔ وہ جوک سے بیتاب ہو کر چلا رہا تھا۔ اس کی ڈائن ماں اُسے راستے ہی میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کبالا کھنڈا کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اُس نے



اسے پال کس کرتا تھا کیا تھا اور کھنڈا بھی کبالا کو بہت چاہتا تھا، کئی بار جب کھنڈا کبالا کو اس دیکھتا تو شوخ نگاہوں سے اس کی طرف تاکت اور پھر دم ہلا کر اس طرح چیخا گویا کہہ رہا ہے: "گو ننگے بھیا کیوں اس ہو میری طرف دیکھو۔ میں بھی تمہاری طرح بات چیت نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں۔ وہ دیکھو اس اخروٹ کی ٹہنی پر کسی خوبصورت چڑیا بیٹھی ہے اسے لو وہ اڑ گئی اور پھر کھنڈا پختے پختے کبالا کے قدموں کے گرد ناچنے لگتا۔ یہاں تک کہ کبالا کا غصہ دور ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر بشارت آ جاتی اور وہ اپنے پیارے کتے کی پیٹھ کو زور سے تھپکے اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اس وقت اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی ہوتیں کھنڈا بھی اتنا بہت شوخ ہو۔ شوخ اور پیارے۔ شوخی تو اروائی اور ذی شہی میں بھی ہے لیکن وہ پیاری نہیں ہیں اور غنا میں غنارت نہیں۔ پر وہ بہت اچھی ہے، کیا تم غنا کو نہیں جانتے وہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے۔ اور اس دن اپنے باپ کیساتھ یہاں آئی تھی۔ نہیں جانتے؟ ذیل کتے، چلو ہٹو یہاں سے۔ اور کھنڈا غرا کر کہتا۔ مجھے نمبردار کی کیا پروا ہے اور میں کسی غنا وینا کو نہیں جانتا اور تم مجھے اپنے پاس سے نہیں بٹھا سکتے۔ میں جنگل کے بھڑیے کی مانند ہوں مجھے کوئی معمول ایسا ویسا گناہ سمجھنا! سچ ہے؟" جب کبالا نے غنا کو پہلے پہل دیکھا تو اس دن دھند

پھانی ہوئی تھی۔ ایک ہلکی لطیف دُھند جو دیوار کے درختوں کو اپنے سفید کبار  
 میں پیٹے ہوئے جنگل کی سبز جھاڑیوں سے لیکر چوٹی کے اوپر آسمان میں پھیلے  
 ہوئے بادلوں تک چلی گئی تھی۔ ساری فضا میں صبح کا سنناٹا قائم ہوا چل رہی  
 تھی۔ نرندوں کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ جب دُھند آجائے تو  
 پرندے بھی خاموش ہو جاتے۔ اس گونگی دنیا میں کبال پہاڑی بھرنے سے  
 نہا کر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک چٹان پر کھڑے ہوئے اس نے  
 دُھند کی دیوی کو دیکھا۔ ہاں یہ دُھند کی دیوی ہی تو تھی۔ سر و قامت، سر سے  
 پاؤں تک ایک سفید دھوئی میں ملبوس۔ اس کا چہرہ کبال کو ایسا معلوم ہوا گویا  
 شبنم کے قطروں میں ڈھلا ہوا گلاب کا بھول دُھند کی ہلکی اور سفید لہروں میں تیر رہا  
 ہے۔ وہ خشک کر کھڑا ہو گیا۔ اور منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔  
 دُھند کی دیوی نے کہا میں رستہ بھول گئی ہوں میں نینا ہوں مجھے گاؤں  
 کا رستہ دکھا دو۔ کبال چند لمحوں کیلئے بت کی طرح کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے نیچے  
 مڑ گیا۔ اس نے نینا کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا دُھند  
 گہری ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور کبال سوچ  
 رہا تھا تم نینا ہو۔ تم دُھند کی دیوی ہو۔ تم رستہ بھول کر آ گئی ہو۔ رستہ، کبال نینا  
 کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ نازک چھوٹے سے گلابی پاؤں؟ اچھا تو وہ  
 چل کیوں نہیں پہننے ہوئے؟ وہ اب ایک ایسا اچھا چل تیار کرے گا

کہ دھند کی دیوی بھی اسے پہن کر خوش ہو جائے پتلا سا چھڑا اور اس پر  
 باریک نقرئی تاروں کے پھول، خوبصورت اور ملائم جیسے نینا کے پاؤں  
 اس کا جی چاہا کہ وہ دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور کچھ کہنے  
 پہجاری کو ان کی پوجا کر لینے دوا اور پھر کیا ایک اسے خیال آیا کہ وہ تو کچھ بھی  
 نہیں کر سکتا اور وہ اس رازِ عظیم کو اپنے دل کے انتہائی گوشوں میں چھپانے  
 کو تیار ہو گیا۔ اب چلتے چلتے اسے ہر لمحہ ڈر رہنے لگا کہ نینا اس سے کوئی  
 بات نہ پوچھے ایک بات، ایک لفظ، اور پھر وہ جان لے گی کہ وہ گونگٹا ہے  
 اور قدرت نے اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا ہے خاموش اور محسوس، شاید پیدا ہونے  
 پر وہ ایک بار پتلا یا ہو گا۔ لیکن اب تو گویائی کی ایک دم ہی باقی رہی اور اس کا  
 سازِ حیات بالکل ہمیں بیجان اور موت کی طرح سا گھن تھا۔ گائوں کی صد کے قریب  
 پہنچ کر کبالا کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے دھند میں پلٹے ہوئے  
 راستے کی طرف اشارہ کیا۔ نینا نے ایک لمحہ کیلئے رک کر پوچھا: "تم کون ہو؟ کہاں  
 سے آئے ہو؟ میں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

کبالا نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور آٹھیں میچی کھڑے ہو گیا۔  
 چند لمحوں کے بعد نینا بولی اہ۔۔۔۔۔ تم کہاں؟ کبالا دیر تک گردن جھکائے  
 ہانڈ نکلائے کھڑا رہا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی برن کی  
 سی آنکھوں سے نینا کی طرف دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہ کیا کہہ سکتا تھا؟

وہ کچھ کہہ سکتا۔ نینا آہستہ سے مڑ گئی۔ سپید وحنہ میں اس کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ کر کبالا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جس دن نینا رہتہ بھول کر کبالا کے دل میں اُتر آئی تھی۔ اس دن کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے زمین کے سوتے ہوئے سب پسنے جاگ اٹھے ہیں مہنڈر کے غلیڑ زاروں میں ایک نئی روحانی اور دل کشی آگئی ہے اور اس کی روح میں خوشی اور نسیم کی حدیں پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے سے مل گئی ہیں شاید اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا اگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اب جب کہ اس کے جذبات کے سیل بکیراں کے چاروں طرف قدرت کے لگے ہوئے آہنی بند دیکھے تو اس کی روح کی تڑپ اور شعرت اس کی بنائی ہوئی چپلوں اور جوتیوں میں منتطب ہو گئی۔ ان دنوں اس نے چپلوں اور جوتیوں کے ایسے ایسے نفیس اور نادر نمونے ایجاد کئے۔ اس کی شہرت بہت جلد اطراف میں پھیل گئی۔ اور لوگ دور دور سے آکر اس سے جوتے اور چپل بنوانے لگے۔ کھنیتر کے موچی نے اس سے اشاروں ہی اشاروں میں کئی بار کہا کہ اب جبکہ تمہاری دکان چمک اٹھی ہے تمہیں شادی کر لینی چاہیئے۔ اور اب وہ بغیر کسی معاوضے کے کبالا کو لہوائی یا ذی شی کارشتہ دینے کو تیار تھا۔ ذی شی اور لہوائی بھی

تو اب اسے اتنا دق نہ کرتی تھیں۔ اب ان کی نگاہوں میں شوخی کیساتھ احترام یا شاید کچھ اور جذبات سمجھنے میں ہوتے تھے شاید اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کبالا کو اپنا ہونے والا غامد سمجھ رہی تھیں اب انھیں کبالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیوتاؤں کے سے چہرے میں، دل آویز رنگت میں اور لمبے گھٹیلے جسم میں جرات مہرنگی اور خوبصورتی کے تمام لوازم دکھائی دیتے تھے جس طرح تالاب میں کاغذ کی ایک ٹکڑی سی ناؤ ڈال دینے سے بھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر وہ بڑھتی ہوئی دائرے بناتی ہوئی چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اسی طرح کبالا کی محبت کی ناؤ نے بھی منہ بڑ کی ساکن فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اور اب یہ لہریں چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔

کنڈا کو اس بات کا پتہ لگ گیا تھا۔ نینا کی سہیلیوں کو اور شاید گاؤں کے اور افراد کو بھی جب گاؤں کی دو خیز اینٹیں نینا کو چھپڑتی تھیں تو نینا کو کبالا پر بہت غصہ آتا تھا۔ بیوقوف گو بھگا ناگل چار نہ جانے وہ اسے کیا کیا کچھ کہہ ڈالتی تھیں۔ اور پھر اسے کبالا کو کیا پتہ تھا کہ نینا کا باپ تو ایک عرصہ ہوا عینا کے بیاہ کا معاملہ طے کر چکا تھا اس نے نینا کو ناشی پور کے بودھ سردار سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے تین ہزار روپیہ پر فیصلہ ہوا تھا۔ ناشی پور کا سردار بہت کمخوس تھا۔ اور وہ ہزار سے زیادہ دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ تب نینا کے باپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ناشی پور کے سردار سے اپنی لڑکی بیاہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی چھٹی بیٹی کو جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے۔ ہاں ناشی پور جہنم سے کم نہ تھا۔

اور بچے اور بچے سنگلاخ پہاڑ دشوار گزار راستے ہر وقت برف و باران ہاشمی پور  
 برف کا جہنم تھا۔ وہ یقیناً اپنی نازک اندام جیٹی کو ہاشمی پور کے بدھ سردار سے نہیں  
 بیاہے گا۔ آخر بڑی مشکل سے تین ہزار پرفیلہ ہوا تھا۔ لیکن کبالا اپنی جگہ خوش  
 تھا۔ نیناد وہاں اپنے باپ کیساتھ اس کی دکان پر چلوں کا ماپ دینے آئی  
 تھی۔ نینا کے لئے اس نے ایسے خوبصورت چل تیار کئے تھے جنہیں دیکھ  
 کر گاؤں کی دوشیزائیں رشک سے جل گئی تھیں۔ نینا کے پاؤں کو جنہیں تہمت  
 نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا چھو کر کبالا کے دل میں یہ خواہش آگئی کہ  
 طرح بزرگ اٹھی تھی کہ وہ ان دو کنول کے پھولوں کو اٹھا کر اپنے سینے میں  
 چھپالے۔ نینا کے باپ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس سے وعدہ  
 کیا تھا کہ وہ بدھ بچوں کو کبہ کر کبالا کے غاندان کی سزا منسوخ کرانے کی  
 کوشش کرے گا اور غالباً جلد ہی کبالا کو اپنے گاؤں میں واپس آنے کی  
 اجازت مل جائے گی اور پھر نینا کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک اٹھیں تھیں۔  
 اور اس نے نہایت مطمئن انداز میں اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ وہ ضرور  
 غریب کبالا کے غاندان کی سزا منسوخ کرادے۔ ان باتوں کو یاد کر کے وہ  
 جوتیاں بتاتے بتاتے خود ہی مسکرا پڑتا۔ ہاں وہ بہت خوش تھا۔ وہ دن بھر اچھے  
 اچھے چل بناتا۔ کھنڈا کیساتھ کھینتا اور صبح و شام اخروٹ کے درخت تلے کھڑے  
 ہو کر دور سے بچے گھاٹی کے سنہری راستے پر گزرتی ہوئی ماہ جہینوں کی طرف

دیکھا۔ ان میں نینا بھی ہوتی تھی پہلے آپنل والی نینا۔

اور پھر ایک دن گھاؤں کے لودار نے کہا لاکو بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی نینا کی شادی ایک دو دن میں تاشی پور کے بدھ سردار سے ہوئی رہی ہے شادی ادا تھی پور میں ہوگی جو ہینڈر اور تاشی پور کی درمیانی حد پر اپنے برفانی پہاڑوں کی ایک تنگنائے میں واقع تھا۔ شادی کی رسوم ادا تھی پور کا مقدس بودھ پجاری سر انجام دینگا۔ نینا بڑی خوش قسمت تھی کہ ایک ایسے بڑے سردار سے بیاہی جائے والی تھی جو کسی طرح بھی ایک راجہ سے کم نہ تھا۔ اور سنا ہے، لودار نے کہا کہ نینا کے باپ نے تاشی پور کے سردار سے تین ہزار روپیہ لیا ہے۔ اب یہ سزا دینے والے بودھ بیچ کہاں سو گئے ہیں۔ گاؤں کا لودار بہت دیر تک اسی طرح کہا لے باتیں کرتا رہا۔ اور کہا لا سر جھکائے ایک چل میں موت کے ٹانھے لگاتا رہا۔ اور جب لودار وہاں سے رخصت ہو گیا تو نمبردار کا بیجا ہوا ایک آگیا اور اس نے کہا لا لے کہا کہ نمبردار کہتا ہے کہ کہا لا لے کہو کہ وہ نینا کی عروسی چل چل صبح تک تیار کر دے کیونکہ انہیں کل صبح ہی ادا تھی پور جانا ہے۔ پرسوں نینا کی شادی ہے۔ نینا کی شادی؛ کہا لا کے دل میں خیال آیا کہ پہلے تو عروسی چل بنانے سے انکار کر دے اس نمبردار کے بھٹے ہوئے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالے نمبردار کی جان لے لے۔ اور پھر اسی پہاڑ کی چوٹی سے گر کر نیچے کی چٹان پر اپنا سر جٹک دے لیکن اس نے بڑی مشکل سے آخر اپنے غصے اور ناامیدی پر قابو پالیا۔ اور نمبردار

کے آدمی سے اشاروں میں کہا کہ وہ نمبردار کے حکم کی ضرورتیں کر گیا لیکن اس وقت اس کے پاس نفرتی شار نہیں ہیں وہ انہیں گھنیرے لایگا اور کل صبح تک عروسی چل چل ضرور تیار کرے گا۔ لیکن دوسرے دن جب نمبردار کا آدمی چل لینے کیلئے آیا تو کہا لانے ہاتھ جوڑ کر اس سے اشاروں میں کہا کہ عروسی چل تیار نہیں ہے۔ وہ گھنیر گیا تھا لیکن اسے نفرتی تار کھیں سے نہ ملے اور وہ بے نیل مرام واپس آ گیا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ عروسی چل کے تیار ہونے سے شادی میں رخصت پڑتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرے وہ بالکل ناچار تھا۔ جب نمبردار کے آدمی نے یہ باتیں اپنے مالک سے کہیں تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ اس نے بدبخت گونگے کو بے نقط سنائیں، کہینہ بدماش گونگا وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے کیا؟ خبیث شیطان کیا وہ سمجھتا ہے کہ اگر عروسی چل نہ ہوگی تو دنیا کی شادی رک جائیگی وہ اس پاجی کو دنیا کی شادی سے واپس آنے پر ضرور مزاح کھائے گا وہ ایسا انتظام کرے گا کہ مہنڈ کے لوگ تو کیا اس پاس کے کسی گاؤں کا کوئی آدمی بھی اس کے ناپاک ہاتھوں کا بنا ہوا جوتان پہنے لیکن ذرا وہ اپنی لڑکی کی شادی سے قانع ہوئے۔

کچھ دیر بعد اسی اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر بالانے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ اوانتی پور کو جانے والے راستے کی طرف اکٹھے



ہو رہے ہیں۔ گھاؤں کے نمبردار کو اس کے مبارک سفر پر رواد کرنے کے لئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ڈھول، قزوں، لیزویں اور مقدس سنتوں کی آواز کے درمیان نمبر داڑینا اور اپنے عزیز واقارب کو لے کر اوانتی پر کی جانب روانہ ہو گیا۔ کبالا دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ساز و سامان سے لدی ہوئی خچریں اور قافلے کے لوگ تنگ راستے سے گزرتے ہوئے اگلے موڑ پر غائب ہو گئے۔

اس کے سینے سے ایک آہ نکلی، اچھا! تو یہ اس کی محبت کا انجام تھا۔ لیکن اسے اس سے بہتر انجام کی امید ہی کیوں ہوئی؟ وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنے بھڑی کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ کھنڈا اس کے قدموں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ کبالا نے غصے میں آکر اسے ایک دو ٹوکریں لگائیں لیکن غریب کھنڈا چلتا یا نہیں۔ بلکہ اپنے مالک کو اس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آگیا۔

کبالا نے گھاٹ پر بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کھنڈا نے اپنی تھوکتی اس کے دونوں پاؤں کے درمیان رکھ دی۔ پھر ایک بہت لمبے عرصہ کے بعد کبالا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کھنڈا کو اٹھایا اور اسے گلے سے پٹا کر چوٹ چوٹ کر رونے لگا۔ غریب گونجے کا منہ کھیز رہا۔ لیکن اسے دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا

ہاں اب اس کا خمیر اسے بار بار ملاست کر رہا تھا۔ کہ اس نے دنیا کیلئے  
 عروسی چل کیوں نہ تیار کر دیا پھر اس کے پاس تھا اور فقر تائی تار بھی۔ یہ  
 کیسی کھینہ حرکت تھی۔ آخر اس میں ینا کا کیا قصور تھا؟ اور اب کیا ینا  
 عروسی چل پہنے بغیر ہی بیاہی جاتے گی۔ ننگے پاؤں، کتنی شرم کی بات  
 تھی، لیکن وہ تو اب بھی اس کے لئے ایک ایسا عمدہ عروسی چل تیار کر سکتا  
 تھا کہ جس پر کنول کے پھولوں کا دھوکا ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کیوں  
 نہ ابھی عروسی چل تیار کرنے کیلئے بیٹھ جائے۔ وہ راتوں رات سفر کرتا ہوا  
 اگلی صبح اوانٹی پور پہنچ سکتا تھا اور شادی سے پہلے خود اپنے ہاتھوں  
 سے ینا کے پاؤں میں چل پہنا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے  
 چل بنانے کا تہیہ کر لیا۔ اور پھر اصراف کرنے بیٹھ گیا۔

جب کبال نے چل کو مکمل کر لیا تو اس وقت مغرب میں شفق  
 کی سرخی بھی باقی درہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل اُٹھ  
 آئے تھے۔ اور اپنے سانس روکے ہوئے پہاڑی کے گرد ملکہ  
 بنائے کھڑے تھے۔ تب دھیمے سے ایک اگھڑائی لے کر رات  
 کی رانی جاگ اُٹھی۔ اور اس نے بادلوں کو اپنے گرد پا کر خوشی اور سستی  
 سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پازیب کی چھٹکار مجھو مند رکے  
 منگولی بھج اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی

تھی۔ اور اس کی کلائیوں میں پڑے ہوئے نفرتی گلگن رہ رہ کر کوند جاتے تھے۔ ان ہی کی چمک میں گاؤں کے لوہار اور کھہار نے دیکھا کہ اوانتی پلو کے پرچ اور دشوار گزار راستے پر کبالا سر جھکائے اور بغل میں کچھ دبائے کھنڈا کو ساتھ لئے جا رہا ہے۔



اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رات مہنڈر کی دادی میں ایک ہیبت ناک چیمٹا ہوا طوفان آیا۔ وہ طوفان جس نے پہاڑ کے بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اٹھیر پھینکا۔ نمبردار کے ادھے گھر کی منقش چھت اڑ گئی۔ اور پراسنے بودھ مندر کا برج پارہ پارہ ہو گیا۔ شمالی ہواؤں کے برفانی خراسے چادوں طرف ژالہ باری کرتے گئے۔ اور پھر ایک شدید ہولناک برفباری شروع ہوئی جس نے صبح ہوتے تک مہنڈر اور کھنڈر اور تاشی پور کے کھساروں کو برف کی ایک سفید گہری چادر سے ڈھانپ دیا۔ اور دوسرے دن دوپہر کے وقت جب تاشی پور کا بودھ سردار اپنی دلہن کو لیکر تاشی پور روانہ ہوا۔ اور برات شہنشاہیاں بجاتی ہوئی اوانتی پور

کی درمیانی بند گھاٹی میں سے گزری تو براتیوں نے دیکھا  
 کہ گھاٹی میں سفید برف پر دور تک قدموں کے نشان پڑے  
 ہیں۔ اور ایک بڑے تناور درخت کے نیچے ایک بد قسمت  
 راہ گیر مرا پڑا ہے۔ اس کا کتا اس کے پاؤں میں منہ دیئے  
 ہوئے اکر ڈگیا تھا۔

راہ گیر کے ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے ہوئے تھے  
 اور وہ ان کی مضبوط گرفت میں کوئی چیز تھامے ہوئے تھا  
 ————— یہ ایک پتلا کاغذی چمڑے کا بنا  
 ہوا عروسی چیل تھا۔ اور اس پر چاندی کی تاروں سے  
 کنول کے دو خوبصورت سفید پھول کرشمے ہوئے تھے



تلاش

وہ مصور تھا۔ اسے حسنِ مصوم کی تلاش تھی۔ اس کی تلاش میں  
 وہ سرسبز وادیوں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں گھومتا رہا۔ اس نے  
 بڑے بڑے شہروں، چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دور دورہ کے اگتے  
 دُکے گاؤں میں اس کی تلاش کی۔ لیکن اسے نہ پاسکا۔ ایک دفعہ  
 ایک کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک گلاب  
 کے حسین پھول کو دیکھا کہ باڑ سے باہر جھکی ہوئی شلخ پر بیٹھا ہوا اس  
 کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ لیکن پشیر اس کے کہ مصور اس  
 کی ایک تہی کا لہکا سانس لے ہی اُٹار سکتا۔ ہوا کا ایک لہکا سا جھونکا  
 آیا۔ اور گلاب کی نازک پتیاں اُٹھلاتی ہوئی ہوا کے دوش پر  
 بکھر گئیں۔

ایک دفعہ جھیل کی نیلی خاموش سطح پر اس نے کنول کے  
 نوزائیدہ پھول کو دیکھا کہ سر جھکائے پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے  
 خوبصورت، نازک، زرد اور سپید اور برف کی طرح پاک و صاف  
 مصور نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا رنگوں والا ڈبہ کھولا۔  
 یکایک جھیل کی خاموش سطح پر چوٹی چوٹی لہریں اٹھیں اور کنول کے  
 پھول کی طرف بڑھتی گئیں۔ انھوں نے اسے اپنی آغوش میں لے  
 لیا۔ اور پھر موت کے دھمکش راگ گاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

کبھی کسی "روں روں" کرتے ہوئے کنوئیں کے قریب  
 سے گزرتے ہوئے مصور کو گمان ہوتا کہ اس نے پانی بھرتی ہوئی  
 حینہ کی آنکھوں میں اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنی تجسس  
 نگاہیں حینہ کے چہرے کی طرف پھیر دیتا اور عین اس وقت کہ جب  
 پتیل کی گاگر میں پانی رقص کرتا ہوا باہر اچھل پڑتا۔ حینہ مصور کی  
 طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی۔ اسی مسکراہٹ جو گویا مصور سے کہہ رہی  
 تھی۔ "میں تجھے صدیوں سے جانتی پہچانتی ہوں" اور کبھی ایسا  
 بھی ہوا کہ کسی بڑے شہر میں چلتے چلتے مصور نے سڑک کے کنارے  
 ایک خوبصورت بچے کو کھیلنے ہوئے دیکھا اور ششک گیا۔ اور اس  
 نے بچے کو پیار سے بلایا۔

شریر ننھے نے مقتد کی طرف ایک چھوٹا سا پتھر کھینچ مارا اور  
 پھر اپنی جسارت پر خود ہی ہنسنے لگا۔  
 مقتد کا دل پریشان ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنی تلاش کو  
 جاری رکھا۔

وہ ایک صحرائی ہرنی کی طرح وحشی تھی اور آسمان پر اڑتی  
 ہوئی ابابیل کی طرح لغزریز، وہ ہر روز جنگل میں اپنا ریوڑ چرانے جاتی  
 تھی۔ وہاں وہ ایک چٹان پر جو مسکبر کانی سے ڈھکی ہوئی تھی بیٹھ  
 جاتی۔۔۔۔۔ گہرے سیاہ اور ریشم کی تاروں کی طرح نرم نازک  
 بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتی اور بیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بچوں  
 سے کھیلتی رہتی۔ جنگل کے گھنے سالیوں میں کہیں کہیں سورج کی  
 کرنیں جھلکاتی رہتی تھیں اور کہیں کہیں دھوپ کے بڑے بڑے  
 بالوں میں چیرہ کے نیچلے جھومر کسی نامعلوم مسترت کے زیر اثر  
 تھر تھراتے رہتے تھے۔ کسی مشرقی ہواؤں کے لطیف جھونکے  
 انہی جھومروں میں بیٹھ کر دلکش گیت سناتے تھے اور پھر کب ایک  
 گیت سناتے سناتے غم جاتے۔ کیونکہ اب وہ پٹان پہ بیٹھی



ہوئی گارہی تھی۔ وہ مسرت اخوانے بیٹر بکریاں کے ننھے پنکڑے  
کیلے میٹھی میٹھی لوریاں تھیں۔ لیکن اکثر ایسا ہی ہوتا کہ گیت سنتے سنتے  
ہوا تھم جاتی۔ پھول غنودگی میں آکر اونگھ اونگھ جاتے اور سارا جنگل کسی  
نامعلوم چننے میں کھو جاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مصور کا گزر اس جگہ سے ہوا۔ وہ  
چٹان پر بیٹھی تھی۔ اور اپنی گود میں ایک بھڑکے بچے کو لئے ہوئے  
اس سے کھیل رہی تھی۔ وہ کبھی اُسے دودھ اوپر ہوا میں پھینک دیتی  
اور پھر باہیں پھینکا کر مہلاتے ہوئے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیتی۔  
اور اسے نودھ سے اپنی چھاتی سے لگالیتی اور کھٹکھٹا کر ہنس پڑتی۔  
مصور نے لڑکی کو دیکھا اور ٹھہر گیا اور بہت دیر تک اسے  
دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا: "ادھر — میرے قریب آ  
کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک نہایت خوبصورت تصویر  
بنائوں گا۔"

دستی لڑکی نے حیران لگا کہ وہ مصور کی طرف دیکھا  
پھر اس نے ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سر کو جھٹک  
دیا۔ اور مصور کے قریب آکر بیٹھ گئی۔



پوچھ سکتی ہوں۔

لیکن چرواہے نے پھر سوال کیا۔ اور کیا تمہیں یہ پتہ بھی نہیں کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے ؟

• نہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس نے مجھے کہا ہے کہ وہ تصویر بنا کر مجھے دیگا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے ؟

نوجوان چرواہا ہنستے ہنستے جھک گیا۔ آہ۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ تمہاری ہی تصویر ہے

۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ بیوقوف مصوم لڑکی۔۔۔۔۔ اوہو۔۔۔۔۔ اوہو ہو تم کس قدر بھولی بھالی ہو۔ اور تم یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ تمہاری تصویر

کیوں بنا رہا ہے ؟ کیوں ؟ اوہو ہو !

لڑکی پریشان ہو گئی اور آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہ کسی دوسرے آدمی کو ہنستے دیکھ کر خود ہنسی۔ پھر ریوڑ کو لے کر وہ آہستہ آہستہ جھل کی طرف چلی گئی۔

مصور نے اس کی طرف دیکھ کر رک رک کر کہا۔  
• تم آج دیر سے آئی ہو اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ رہی ہو؟

• ہاں مجھے آج دیر ہی ہو گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مصور کی موجودگی میں ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتی تھی



محبت ہے۔ تم بہت حسین ہو قلی، کیا تم نہیں جانتی ہو کہ تم کس قدر  
 حسین ہو؟ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، میری مصوم لیسٹ  
 محبت، کیا تمہیں پتہ ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں؟  
 جیسے لیلٰی کی روح کا ذرہ ذرہ صدیوں کی نیند سے جاگ  
 اٹھا۔ کوئی اس کے دل کے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹاتا تھا  
 اور چلتا چلتا کہہ رہا تھا۔ اٹھ بھکان دروازہ کھول دے کہ یہ معبد  
 میرے بغیر سونا پڑا ہے۔ کوئی اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی  
 کوشش کر رہا تھا۔

یہ ایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور پھر اسے  
 ایسا معلوم ہوا گویا معبد کے دروازے کھل گئے اور لاکھوں کرداروں  
 بیماری سمندر کی لہروں کی طرح جھکولے لیتے ہوئے اندر داخل ہو  
 گئے۔ طوفان، بادل کی گرج، بجلی کے چمکتے ہوئے تیز دھاریں  
 اور لاکھوں گھنٹیوں کا پُر شور آواہن، لیلٰی یک لحظہ ڈر گئی۔ ایک  
 عجیب خوف و ہراس سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اس نے  
 تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ گئی۔

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں آنسو بار  
 بار آئے۔ لیکن نیند ایک دفعہ بھی نہیں آئی۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر وہ جیل کے کنارے گئی اور دیر تک اپنا چہرہ دکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بالوں کو دیر تک سنوارا اور دیر تک ہی اپنی نرم نرم اور سونے کی طرح حسین باہوں کو صاف کرتی رہی۔ جب وہ جیل کے کنارے سے اٹھی تو اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور ایک انگڑائی لے کر منہ ہی، ایک عیب نہی، صبح کی پہلی کرفول میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے۔

جگل کی طرف باتے ہوئے راستے میں اس نے منہ کے پھولوں کا ایک گچھا دیکھا۔ اس نے اُسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔ اب اس کی نگاہوں میں نئی چمک تھی۔ اور لبوں پر ایک نئی مسکراہٹ جب مصور نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے متوحش اور دردناک لہجہ میں پوچھا۔ "تم اسے کہاں چھوڑ آئیں؟"

لیکن لڑکی کچھ نہ سمجھی۔

مصور اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکی کے قریب گیا۔ اور اس کے نشانے زور سے ہلا کر کہنے لگا۔ "آہ یہ تم نے کیا کر دیا، تم نے اُسے کہاں چھوڑ دیا۔"

لڑکی کچھ نہ سمجھی، لیکن مسکرا دی۔

مصور گلو گھر لہجہ میں چلا یا۔ "وہ کہاں ہے پچ بتاؤ وہ کہاں

ہے! میری بیٹے..... کم غبت لڑکی!.....

پھر یک نیت مصور نے اس کے شانے چوڑ دیئے۔ اس نے حویں اور شاید عیشمیں گنگاہوں سے لڑکی کی نامکمل تصویر کھینچ دیکھا۔ آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اُسے چوکھٹے سے باہر کھینچ لیا۔ پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے آہستہ سے اس نے چوکھٹے کو تہ کیا۔ رنگوں اور برشوں کے ثبے کو سنبالا اور لڑکی پر ایک نگاہ تک ڈالے بغیر مغرب کی طرف مڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

چند لمحے گزر گئے۔ لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر یکایک رونے لگی۔ اور روتے روتے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی۔ ”مت جاؤ، آہ اجنبی مصور مت جاؤ۔“.....

لیکن مصور نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے جھل کی مغربی سمت کو جا رہا تھا لڑکی پریشان نگاہوں سے کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مصور کھینچ کبھی اپنی نامکمل تصویر کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ لیتی تھی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ہوا چڑھ کے نیچے تہوں میں گزرتی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی جہیں دو جھل میں کوئی بھڑ کا بھڑا ہوا بچہ چلا رہا تھا۔ بنفشے کے پھولوں کا گچھا لیل کے پاؤں میں گرا پڑا تھا

# ہماری کتابیں پیاری کتابیں

زرگاؤں کی انی کرشن چندہ ۶/۱۵	محبت ایک کائنات گمشدہ ۱۵/-
چند اکی چاندنی ۱۰/-	تنہا چاند ۱۵/-
پیاری خوشبو ۱۰/-	کئی پیٹنگ ۱۸/-
میں عینی مال ۱۰/-	ملین ۱۳/۵۰
نظائے ۱۰/-	شرمیل ۱۲/۵۰
سپنوں کے پھول ۱۰/-	امریل صحت بخاتی ۱۵/-
سپنوں کے قیدی ۱۰/-	ایا بسنت سکھی (۱۰ جلد) ۱۳/-
آئیے اکیلے ہیں ۱۵/-	تو چاند میں سمند امرتارجم ۱۵/-
ایک عورت ہزار دنیائے ۱۵/-	ساڈا بابا جناح ڈاکٹر جادوگر ۱۵/-

بکے از وطنیاد

بک کا زمر چوک فیصل شہید بازار گلان حلیم



# ناولوں کا ایک شاندار انتخاب

<p>ایک عورت ہزار دلوں کے</p> <p>کوشن چندر ۱۵/-</p>	<p>آئینے اکیلے میں</p> <p>کوشن چندر ۱۵/-</p>	<p>زرگاؤں کی رانی</p> <p>کوشن چندر ۶/۷۵</p>
<p>چند اکی چاندنی</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>	<p>مسنینی تال</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>	<p>پیار کی خوشبو</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>
<p>پسپوں کے پھول</p> <p>کوشن چندر ۱۰/-</p>	<p>نظارے</p> <p>کوشن چندر ۵/-</p>	<p>پسپوں کے قیدی</p> <p>کوشن چندر ۱۲/-</p>

مک کارنر فون ۲۸۸۵  
چوک فنیل شہید جہلم شہر

کوشش چندر کی  
لافا فی کتابی

## لأفانی کتابی

- |          |       |                      |
|----------|-------|----------------------|
| ۱۵ روپے  | _____ | آئیے رکھتے ہیں       |
| ۱۰       | _____ | چند کی چاندنی        |
| " ۱۰     | _____ | پیار کی خوشبو        |
| " ۱۰     | _____ | میں نشی مآل          |
| " ۶۰.۷۵  | _____ | نہ گاؤں کی رانی      |
| " ۱۵     | _____ | ایک عورت ہزار دیوانے |
| " ۱۲۰.۵۰ | _____ | سپنوں کے پھول        |
| " ۱۰     | _____ | نظارے                |
| " ۱۲     | _____ | سپنوں کے قیدی        |
| " ۹      | _____ | ہنگ کانگ کی حسینم    |
| " ۱۵     | _____ | شیلو                 |

۱۰۔ حَیْذ (گی پانڈی) —————

۱۰۔ بیماری خوشبو

• مس نیکی مائی ————— ۱۰ •

• ننگوں کی رانی ————— ۲۰۷

۱۵۔ ایک عورت بنیادی کو آنے

۱۲.۵۔ سینوں کے کھٹوں

۱۰. نظارے

۱۲۔ سینوں کے قیدی ————— ۱۲

• ہنگ کانگ کی حسینہ — ۹ •

شیلو. \_\_\_\_\_ ۱۵

ریک کارنی چوک فیصلی شہید فوٹن نمبر ۲۸۸۵، جہلم

# ہماری کتابیں

۱۰/-	چند اکی چاندنی	۲۵/-	شیریں سلطان نیو
۱۰/-	پیار کی خوشبو	۲۵/-	تاریخ جد و جہد ازادی
۱۰/-	مس مین تال	۱۵/-	ساڈا ہا ہا جناح
۱۲/۵۰	نقارے	۱۵/-	صحت خباتی
۱۰/-	پسوں کے پھول	۱۲/-	تسوی سی سی پاگل
۱۲/۵۰	پسوں کے قیدی	۱۸/-	محبت ایک کائنات
۶/۴۵	نور گاہوں کی رانی	۱۵/-	تنہا چاند
۱۵/-	آپٹے لکھے ہیں	۱۸/-	کٹی چٹک
۱۵/-	ایک عورت ہزار دیکھنے	۱۳/۵۰	بہن
۱۰/-	قسمت کے مجید	۱۲/۵۰	شہر میل
۱۵/-	آپ چاند میں سمندر	۱۳/-	آیا بنت سکی

تمام کتابیں بجلد اور عمدہ سرورق سفید کاغذ پر چھپ کر تیار ہیں

پیشکش پاکستان پبلشرز اینڈ  
جنرل آرڈر سپلائرز  
چوک فیصل شہید

ہیک کاز

۲۸۸۵ بین بازار حیلہ فری